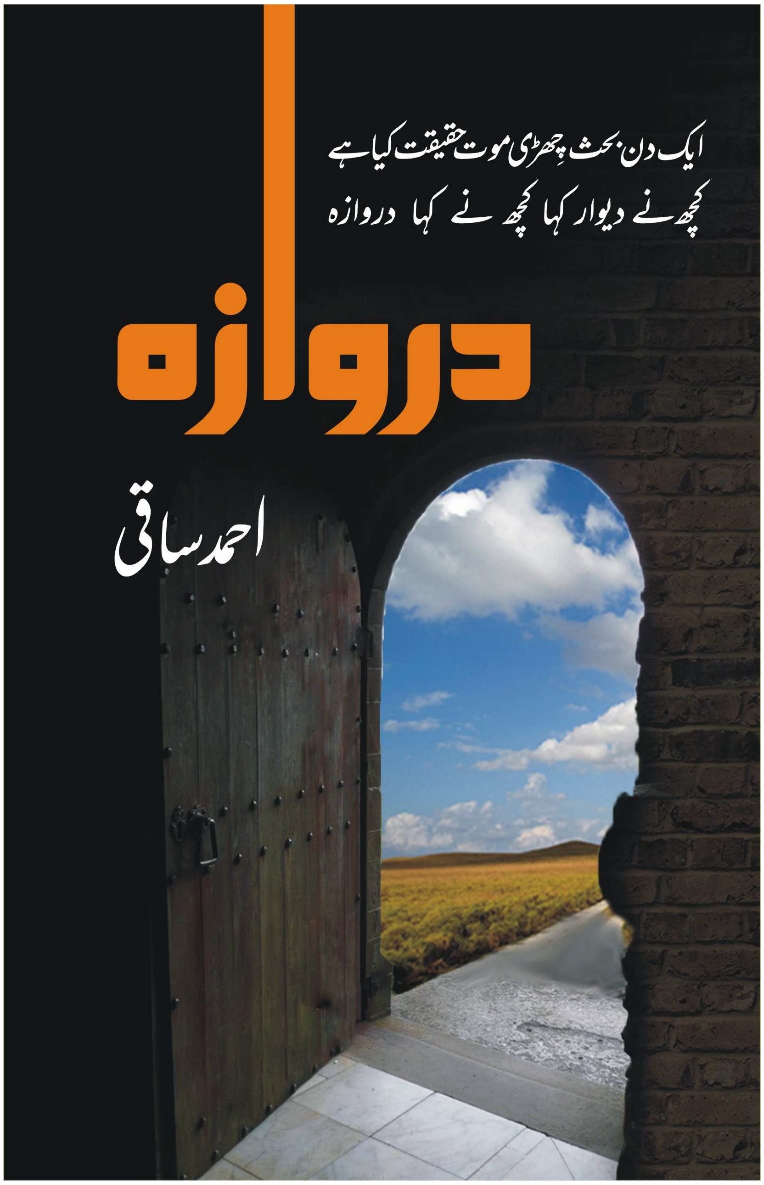

ایک دن بحث چھڑی موت حقیقت کیا ہے
کچھ نے دیوار کہا کچھ نے کہا دروازہ
دروازہ
احمد ساقی

نام کتاب	:	دروازہ
سرورق	:	غلام مصطفیٰ المعروف مغلچی
کمپوزنگ	:	ایم عمران حسینی
سن اشاعت	:	جون 2018ء
قیمت	:	400 روپے
ناشر	:	
تعداد	:	500

فہرست

انتساب

اپنی نورِنظر،لختِ جگر بٹیاؤں
ڈاکٹرزنیرہ ساقی اورڈاکٹرفائزہ ساقی کے نام

میری بٹیا! مرے آنگن میں تُو رحمت کی طرح ہے
میرا کردار ترے حق میں ضمانت کی طرح ہے

تیری تکریم مرے پیارے محمد ﷺ کا چلن ہے
تجھ سے اعراض شریعت میں خیانت کی طرح ہے

❖❖❖

پیش خیمہ

میرے ہاں سخن طرازی زیست سے پیوست ''یافت'' کا عمل ہے الفاظ و معانی کی اوٹ سے پھوٹتی ہوئی روشنی جو قوتِ فکر کو انگیخت کرے اور احساسات و جذبات میں خوشگوار حیرتوں کو جنم دے۔ شاعری حسنِ کلام کا دوسرا نام ہے جو اجمال اور اختصار سے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے جمالیاتی حسوں کو موزونیت سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ خاص طور پر ہیئتِ غزل اساسِ عشق کے سبب اردو شاعری میں ایک ممتاز مرتبت کی حامل ہے۔ اسی لیے ہر شاعر کا پہلا عشق غزل کی صورت سامنے آتا ہے۔ اصحابِ نقد و نظر کے ہاں اچھے شعر کی خصوصیات کے بارے میں اختلاف موجود ہے بعض لفظی بندش اور بعض مضمون کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں مگر شعر گوئی میں سلیقہ مندی پر سب متفق ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر شعر ندرت کا حامل ہو، جو کہ ممکنات میں بھی نہیں، ہاں مگر شعر تکلف کا تقاضا ضرور کرتا ہے بشرطیکہ غیر ضروری نہ ہو۔

''کھنکتی خاک'' شعری حوالے سے میرا پہلا پڑاؤ تھا، ناقدین اور قارئین نے میری توقع سے کہیں زیادہ اس کی تحسین کی۔ میں تہِ دل سے ان تمام اصحابِ نقد و نظر کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اعتبار بخشا۔ کچھ ایسی آوازیں بھی سنائی دیں کہ ''کھنکتی خاک'' کی شاعری خواص کی شاعری ہے شاید اس کی وجہ ان مضامین کا غالب عنصر ہو جو انسان، کائنات اور خدا میں حقیقی ربط کی جستجو سے سخن ہوئے۔ بعض ناقدین نے اسی پہلو کو انفرادقرار دیتے ہوئے کہا کہ اس سے جہانِ غزل کے کئی نئے در کھلے ہیں۔ یہ دونوں پہلو میرے لیے طمانیت کا باعث ہیں کیونکہ ان میں میری ستائش کا پہلو ہی جھلکتا ہے اور فطرتاً ہر شخص ستائش پسند ہے۔

خود پسندی کا نشہ ایسا نشہ ہے احمدؔ　　　مَیں نے جس جس کو بھی دیکھا وہی خوگر نکلا

بہرکیف ''دروازہ'' کی شاعری میں یہ عنصر غالب نہیں میں نے شعوری طور پر سابقہ منہج سے کسی حد تک اعراض کیا ہے مگر انحراف نہیں۔

یہاں خصوصی طور پر اپنے سینیئر دوست غلام حسین ساجد کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کا دیباچہ لکھا اور قدم قدم پر مشاورت کا حق بھی ادا کیا۔ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے کمالِ محبت کا اظہار کرتے ہوئے آخری لمحات میں اس کتاب کے لیے مضمون تحریر فرمایا جو میرے لیے باعثِ اعزاز ہے۔اس ذرّہ نوازی پر میں ان کا تہِ دل سے شکرگزار ہوں۔

اس کتاب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ میں محمد نعمان حمید، محمد عمران حسینیؔ اور ماجد رضا امبرؔ نے بہت محنت کی۔ان کی برخورداریت کا معترف ہوں۔غلام مصطفیٰ المعروف مغلچی کمال کے آرٹسٹ، خطّاط اور شاعر ہیں۔کتاب کے ٹائٹل کی تزئین و زیبائش انہیں کا خاصہ ہے۔اُن کی محبت کا بھی مقروض ہوں۔

اوکاڑا شہر کے شعری منظر نامے میں ظفر اقبالؔ، اسلم کولسری مرحوم، ناصر شہزاد مرحوم اور آنجہانی اقبال صلاح الدین جیسے قد آور شعراء موجود ہیں جن کی وجہ سے اوکاڑا پاکستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں پہچان رکھتا ہے۔موجودہ منظر نامے میں بھی بہت سارے قابلِ ذکر اصحابِ شعر موجود ہیں جن کا فرداً فرداً ذکر کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔آمین

آپ کی آراء کا منتظر اور دعاؤں کا طالب

احمد ساقیؔ

0300-6647627

0301-8590195

دروازہ

''کھنکتی خاک''احمد ساقی کا پہلا قدم تھا مگر بھرپور استقامت اور علمی بصیرت کی بنیاد پر اُٹھایا ہوا۔فکری اور تخلیقی ابعاد کو وفورِ شعری سے آمیخت اور شگفت کرتا ہوا کہ جس کی مہک نے ایک جہاں کو اپنے حصار میں صرف اسیر ہی نہیں کیا، اپنا حدی خواں بننے پر مجبور بھی کیا اور ایک جادوئی لپک سے برسوں کے سفر کو ایک لمحے میں سمیٹ لیا۔یہ کتاب موجود اور غیر موجود کی سرّیت کو اُجاگر کرتی انسان اور فطرت کی ہمدمی کا استعارہ تھی اور اس کی رگوں میں تخلیقی اُپج کے علاوہ ذہانت اور تجربے کا لہو دوڑتا تھا۔

اب ''دروازہ'' میں انہوں نے زندگی کی حقانیّت کو ایک کلاسیکی آدمی کی طرح نہایت دِقّتِ نظر سے دیکھا ہے اور اشیاء اور اُن سے جڑے ہوئے انسانی رویّوں کو غزل کی توانا اور پیش قدمی کرتی ہوئی روایت کے تناظر میں بیان کیا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ ''غزل''اور زندگی کی ماہیت میں ایک عجیب مماثلت ہے کہ دونوں میں فرداسے ہم آغوش رہنے کی خُو ہے، کیونکہ غزل کا متن زندگی سے اس طرح ہم آغوش ہے جیسے شکر یا نمک پانی سے۔ایک ایک قطرے میں اپنی موجودگی کا اعلان کرتے ہوئے مگر لاکھ دیکھنے پر بھی دکھائی نہ دینے والے۔احمد ساقیؔ کے یہاں بھی غزل معاملاتِ زیست کی علامت بن گئی ہے اور ہم اس ''دروازہ'' سے کسی اجنبی خطے میں داخل نہیں ہوتے بلکہ خود اپنے وجود کے ریگ زار میں اُترتے ہیں، اِک ایسا ریگ زار جس میں کہیں شدتِ گریہ سے نخلستان پھوٹ نکلا ہے تو کہیں تبسمِ زیرِلب سے مرغزار کھل اُٹھا ہے۔کہیں دمِ سحر سے خاک اُڑتی ہے تو کہیں دستِ زمہریر سے آس چٹخ کر بکھر جاتی ہے۔''دروازہ''ایک کتاب نہیں اندر کے موسموں کی کتھا ہے اور اسے پڑھ کر ہم خود اپنے آپ سے آملتے ہیں، اپنی موجودگی کا ادراک کرتے ہیں۔چند شعر دیکھئیے:-

دیکھ کر چاند تلاطم ہے بپا سینے میں   مَیں سمجھتا تھا جسے دل وہ سمندر نکلا
عمر بھر جس کو تلاشا تھا سرِ کون ومکاں   وہی مطلوب مری خاک کے اندر نکلا

☆☆☆

حیرتی ہوں لب تو ہلتے ہیں صدا آتی نہیں   ایسے سنّاٹے میں لگتا ہے خدا بولے گا بس
بندھ گیا ہے سلسلہ اشکوں کا مری آنکھ سے   اب ترا دستِ حنائی یہ گرہ کھولے گا بس

☆☆☆

یہ وہ دستک ہے کہ دروازہ جسے جانتا ہے   خود بخود یونہی نہیں کھلنے لگا دروازہ
کئی دروازے نکل آتے تھے دروازے سے   ایسے لگتا ہے کہ اب بانجھ ہوا دروازہ

☆☆☆

جب بھی میں تیری حقیقت کا طلبگار ہوا   میرے اندر سے ترا عکس نمودار ہوا
منزلِ شوق میرے سامنے دوگام پہ تھی   اشتیاق اتنا کہ چلنا مجھے دشوار ہوا

☆☆☆

یہی مشکل پڑی ہے مجھ پہ آسانی کے ہاتھوں   کہ ارزاں ہو گیا ہوں مَیں فراوانی کے ہاتھوں
جونہی وہ حسنِ مطلق کھل رہا تھا میرے آگے   مَیں پتھرانے لگا تھا اپنی حیرانی کے ہاتھوں

☆☆☆

''دروازہ'' اپنے موجود اور عصر سے کلام کرتی ہوئی کتاب ہے۔ احمد ساقی عمر اور تجربے کی جس سطح پر ہیں وہاں شاعر کے رویّے میں حیرت اور استعجاب سے زیادہ تجزیے اور تیقّن کا رنگ غالب ہوتا ہے اور اُس کا عصر اور موجود ایک توانا حقیقت بن کر ظہور کرتے ہیں۔ کوئی تخلیقی آدمی اپنی زمین اور ماحول سے کٹ کر نہیں رہ سکتا اس کا Locale غیر محسوس طور پر اُس کے تخلیقی عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہاں کی اخلاقی قدریں، یگانگت اور خلیج، باہمی تعلق اور رنجشیں، سب سے بڑھ کر عالمی پس منظر میں وارد اور اثر انداز ہونے والی رذالتیں جس طرح حبس دم میں اضافہ کرتی ہیں، وہ کوئی کہنے کی بات نہیں ہے۔ ''دروازہ'' میں یہ سب کچھ کسی شعوری کوشش کے بغیر آیا ہے اور خوب آیا ہے۔ ذرا دیکھیئے -:

جس اذیت سے اُٹھائے ہیں جنازے ہم نے   اُس سے بہتر تھا کہ ہم لوگ بھی مارے جاتے

ایسی تصویر کبھی دیکھنا ہوتی نہ نصیب   اس وطن کے جو خدوخال سنوارے جاتے

☆☆☆

گناہگار بھی ایسے کہ شرم آتی ہے   ہم اپنی مٹی سے ہی کاروبار کرتے رہے

☆☆☆

رگوں میں ایسا بسا ہے کہ باہر آتا نہیں   علاج کیا کیا جائے چھپے ہوئے ڈر کا

☆☆☆

جاری ہے اس جہاں میں مکافات کا عمل   یہ جانتے تھے اہلِ نظر سوچتے نہ تھے

☆☆☆

ہوائے حرصِ و ہوس ساتھ ساتھ جاری ہے   بنامِ عزو شرف انحطاط جاری ہے

☆☆☆

یہ خداداد وطن ہے، کوئی پرسان نہیں   جتنا بھی ہاتھ میں آتا ہے اُٹھا لے جائیں
رو پڑا غربت و افلاس کا بخیہ بخیہ   اب فقط تاج نہیں سر بھی اُچھالے جائیں

☆☆☆

اس انتخاب کے آخری دوشعر ارضِ وطن میں پیدا ہونے والی انارکی اور معاشی بدحالی کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ ساتھ فیضؔ کی پیش بینی کی توسیع بن کر سامنے آتے ہیں مگر یہ مماثلت محض اتفاق ہے کیونکہ احمد ساقیؔ بلند آہنگ شاعر ہیں وہ سیاسی نعرہ بازی کو اپنے مزاج پر غالب نہیں آنے دینا چاہتے۔ اُن کے یہاں اس مزاج کا پرتو ہمارے عصری رویّوں کی دبازت سے پڑا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ ہر شاعر کو اپنے عصر سے مکالمہ کرنا ہی پڑتا ہے ورنہ احمد ساقیؔ کے کلام کا غالب حصہ عشق اور معاملاتِ عشق، جسے عرفِ عام میں ”غزل رنگ“ یا تغزل کا نام دیا جاتا ہے، سے متعلق ہے اس لیے کہ انسانی زیست کی بنیاد اور غالب سچائی انسان کا انسان سے تعلق ہی ہے اور احمد ساقیؔ کے یہاں اس تعلق کی سبھی پرتیں نمایاں ہوئی ہیں۔ اس طرح ”دروازہ“ کی شاعری ایک روحانی تجربہ بن کر اس تجربے کی فروعات سے مکالمہ کرتی ہے اور نہایت لطیف احساسات کو اجاگر کرتی ہوئی ایک ایسی کتھا سناتی ہے جو ذات سے ذات کا سفر ہونے کے علاوہ دو انسانوں کی باہمی یگانگت اور دوری کا میورل بھی ہے۔

اس عشق کی اب دیکھئے کب اس کو خبر ہو   یہ بات ابھی تک تو مرے اپنے تئیں ہے
ہر لمحہ مری سانس نے محسوس کیا ہے   دھڑکن کی طرح کوئی مرے دل کے قریں ہے

☆☆☆

عشق کے سارے تقاضوں کی خبر ہے مجھکو   تیرے دربار پہ بے نام و نسب آیا ہوں

☆☆☆

گدائے عشق ہوں انکار آپ کا حق ہے   مگر سلیقے قرینے سے ٹالیے مجھ کو

☆☆☆

مجھ سے بے خانماں کا درماں ہو   اپنے پہلو میں کچھ جگہ دیجے
پھر سے آغازِ عشق کرتے ہیں   سابقہ تلخیاں بھلا دیجے

☆☆☆

تری آنکھوں نے نمو بخشی دلِ ناشاد کو   دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے ہرا ہونے لگا

☆☆☆

وہ کہانی بھی عجب عشق کہانی تھی میاں   مَیں تو خاموش تھا، دل بول رہا تھا مجھ میں

☆☆☆

تجھے خبر نہیں مَیں نے تری محبت میں   دلِ و نگاہ کی کچھ بازیاں بھی ہاری ہیں

☆☆☆

مجھے معلوم ہے اس خط کے اندر   مرے محبوب نے کیا کیا لکھا ہے
مرے اشعار میں اِک داستاں ہے   محبت کا سفر نامہ لکھا ہے

☆☆☆

محبت کا یہ سفر نامہ احمد ساقیؔ نے بہت سلیقے اور جذباتی وفور سے لکھا ہے۔ اگر چہ وہ اپنے ایک شعر میں کسرِ نفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حوالے سے اپنے بے ڈھب ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔(ہر کام کیا میں نے سلیقے سے ادب سے۔۔بس عشق ہی کرنا نہیں آیا مجھے ڈھب سے) مگر اس کتاب کا متن کچھ اور ہی کیفیت نمایاں کرتا ہے۔ آدابِ عشق اور معاملاتِ محبت کی جو سطح اس کتاب میں ہے، وہ شاعر کے خود پسند ہونے پر نہیں اس کے محتاط ہونے اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی عکاس

ہے، جس میں ادب کو پہلا قرینہ شمار کیا گیا ہے اور وفا شعاری پر اصرار کے بجائے موجود و میسّر پر شادماں ہونے کی کیفیت غالب ہے مگر اس میں تموّج کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب بات معاملہ بندی تک جا پہنچتی ہے اور شاعر کی طبیعت وجد میں آنے پر مصر ہوتی ہے۔

مست موجوں نے لیں اُٹھ اُٹھ کے بلائیں توبہ　　دیکھ کر گیلا بدن جوش میں آیا دریا

☆☆☆

اس نے ترچھی نظر سے جو دیکھا　　سانس لینی بھی ہو گئی مشکل

☆☆☆

اگرچہ پشت کیے بیٹھا تھا مری جانب　　وہ دیکھتا تھا مجھے بار بار شیشے میں
سنور رہا تھا مقابل تھے آئنے احمدؔ　　مجھے بھی اس نے کیا تھا شمار شیشے میں

☆☆☆

بنتِ حوّا جو نہ ہوتی تو یہ ابن آدم　　آب و دانے پہ فقط کیسے گزارا کرتا

☆☆☆

پہلے وہ حسن کو لفظوں میں بیاں کرتی رہی　　بعد ازاں اپنی ہی تصویر اُٹھا لائی ہے

☆☆☆

میری دوری بھی گوارا نہیں ہوتی اُس کو　　مَیں اُسے پاس بلاؤں تو وہ گھبراتا ہے
اپنی تنہائی میں کرتا ہے وہ مجھ سے باتیں　　اور جب سامنے آتا ہے تو شرماتا ہے

☆☆☆

عربی زبان و ادب سے خاص نسبت کے باعث احمد ساقیؔ کے یہاں بحور اور اوزان کے تجربوں پر پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب ”کھنکی خاک“ کے پیش لفظ میں بات کر چکے ہیں۔ اسی لیے اُن پر بات کرنے کا یہ محل نہیں مگر ان تجربوں سے پیدا ہونے والے امکانات کا ادراک اور ان کی افادیت کو تسلیم نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ احمد ساقیؔ نے ”دروازہ“ میں اسی نعمت کو کم کم استعمال کیا ہے مگر جہاں استعمال کیا ہے ایک نئی شگفتہ روایت کا اضافہ کیا ہے اور خوب کیا ہے جیسے:

ہم کبھی آگ تھے جو بجھ کے ہوئے راکھ کی مانند　　وقت کے آگے پڑے ہیں خس و خاشاک کی مانند
خلعتِ فقر کا طالب ہوں مگر خواہش دنیا　　چپکی رہتی ہے بدن سے کسی پوشاک کی مانند

اب بھلا کون تراشے گا مجھے دستِ ہنر سے　اب کوئی چاک گھماتا ہی نہیں چاک کی مانند

☆☆☆

سنبھلتا کیسے سنبھالا نہیں گیا گئی رُتوں کا حوالہ نہیں گیا
دمک رہا ہے وہ میرے وجود میں بجھا چراغ اجالا نہیں گیا
فلک کی آنکھ میں لالی ہے کس لیے ابھی لہو تو اچھالا نہیں گیا
نظر پڑے ہیں جو فاقہ زدہ بدن گلے سے نیچے نوالہ نہیں گیا

☆☆☆

آخری شعر میں شاعر کی انسان دوستی ایک مضبوط حوالہ بن کر ظاہر ہوئی ہے اور احمد ساقی کے یہاں یہ کیفیت برائے شعر گفتن نہیں ''دروازہ'' کا ایک پٹ ان روشنی سے محروم گلیوں اور آنگنوں میں کھلتا ہے، جہاں محرومی راج کرتی ہے اور دُکھ کی حکمرانی ہے اور شاعر کی ہمدردی ایسے ہی مقہور اور مہجور لوگوں سے ہے۔

اِک لقمۂ حیات پہ بہنے لگا لہو　انسان اپنے عہد کے سفّاک ہو گئے

☆☆☆

شہر میں قحط پڑا بھوک نے چاٹا جو بدن　ہاتھ سے کاسہ گرا اور ہوا قصّہ تمام
مرنے والوں کو یوں دستارِ فضیلت بخشی　ماتمی جلسہ ہوا، نوحہ کیا ، قصّہ تمام

☆☆☆

بھوک مٹتی ہے نہ رہنے کو مکاں ملتا ہے　بے نواؤں کو تو ایسا ہی جہاں ملتا ہے

☆☆☆

محمد سلیم الرحمن نے کہا ہے اور میرا اِدّعا ہے کہ غزل کی کتاب کے حوالے سے بات کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ غزل زندگی سے مکالمہ کرتی ہے اور اس کی ہیئت، زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو منقش کرنے پر قادر ہوتی ہے، جب کہ نظم، اپنی طوالت کے باوجود کسی ایک تجربے کی امین ہوتی ہے۔ ''دروازہ'' بھی غزل کی کتاب ہے اس میں لگ بھگ 100 سے زیادہ غزلیں ہیں اور کم و بیش 800 کے قریب اشعار ہیں اس طرح اتنے ہی حسّی تجربوں کی امانت دار ہے اور زندگی کی کئی مانوس اور نامانوس حقیقتوں کی ترجمان، اس لیے اس کے باطن کا کُلّی احاطہ کرنا اور اس کی ندرت کو

تحریر میں لانا ممکن ہی نہیں۔ مجھے تو صرف اُن غالب فکری رویّوں کو اجاگر کرنا ہے جو دانستہ یا نادانستگی میں پلٹ پلٹ کر سامنے آئے ہیں اور شاعر کی باطنی صباحت کی پہچان بنے ہیں۔ایسا ہی ایک حوالہ اور دائمی موضوع انسان کا اپنے خوابوں کو یاد بنتے دیکھنا ہے۔احمد ساقیؔ عمر کے جس دور سے گزر رہے ہیں اس میں اس حقیقت کا ادراک بڑھ جاتا ہے اور پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی عادت پختہ ہو جاتی ہے۔''دروازہ'' میں بھی یہ منظر بار بار اجاگر ہوتا ہے اور شاعر کی حقیقت پسندی کا اثبات کرتا ہے۔

ایک سیلاب اُمڈ آیا تری یادوں کا اور میں دیر تلک بہتا رہا پانی میں

☆☆☆

اُس کی یادوں سے بڑی معرکہ آرائی ہوئی پھر کہیں جا کے مرے دل سے وہ پیکر نکلا

☆☆☆

تمہاری یاد کے گلشن سے پھول چن چن کر خزاں نژاد رُتوں کو بہار کرتے رہے

☆☆☆

گزشتہ شب تری یادوں کے بادل کھل کے برسے ٹپکنے لگ پڑی آنکھیں بھی طغیانی کے ہاتھوں

☆☆☆

جو دھول بن کے مسافت میں دب گئے احمدؔ مَیں مثلِ آئنہ وہ ماہ و سال دیکھتا ہوں

☆☆☆

کوئی تصویر ٹھہرتی ہی نہیں آنکھوں میں بہتے پانی میں فقط عکس رواں ملتا ہے

''دروازہ'' کی ایک اور خصوصیت زندگی کی بے ثباتی اور جبر و قدر کا مسئلہ ہے مگر یہ اس لیے انوکھا اور نادر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں ایک نئی جہت شاعر کی اپنی ذات سے جڑی حقیقت نے پیدا کی ہے اور وہ ہے ڈھلتی ہوئی عمر سے نمو کرتا ہوا اور کبھی اس کے پس منظر میں نمایاں ہوتا ایک خاص طرح کا کڑواہٹ بھرا احساسِ زیاں جو کبھی استعارہ، کبھی علامت اور کبھی حقیقت بن کر ظہور کرتا ہے اور قاری اور شاعر کو پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ذرا دیکھیے:۔

بجھتی آنکھوں نے لجاجت سے اجل سے پوچھا مہرباں تھوڑی سی تاخیر نہیں ہو سکتی؟

☆☆☆

مرنے والوں سے جا کے پوچھے کوئی کتنی ہوتی ہے جاں کنی مشکل

☆☆☆

ایک دن بحث چھڑی موت حقیقت کیا ہے کچھ نے دیوار کہا کچھ نے کہا دروازہ
خوابِ غفلت میں رہا توبہ کا آیا نہ خیال اور جب آنکھ کھلی بند ہوا دروازہ

☆☆☆

میری جب آنکھ کھلی حکم ہوا ہجرت کا باقی جو کچھ بھی ہوا وہ پسِ دیوار ہوا

☆☆☆

ہئیت موت ہی بدل جائے زندگانی ہی زندگانی ہو

☆☆☆

ادھڑی ادھڑی ہے مری کھال نزاری ہے بدن یہ تو ہجرت کا مجھے رختِ سفر لگتا ہے

☆☆☆

جانے کس حال میں ہوں گے کبھی جانے والے کاش اِک بار مجھے اُن کی خبر لگ جائے

☆☆☆

سارے کردار ہیں کہانی سے یہی سیکھا ہے زندگانی سے
ایک اِک کر کے اُٹھتے جاتے ہیں یار سارے جہانِ فانی سے

☆☆☆

مانا ترا رسوخ ہے دنیا جہان میں لیکن قضا کے سامنے تو معتبر نہیں

☆☆☆

یہ آنکھ جسے ڈھونڈتی پھرتی ہے جہاں میں وہ صورتِ تمثال سرِ خاک کہیں ہے

☆☆☆

صدا بلند ہوئی احتساب ہونے لگا مرے وجود سے پھر میرا ناتا جوڑا گیا

☆☆☆

یہ اس لیے کہ شاعری اور زندگی ایک دوسرے کا بدل ہوتی ہیں اور شاعر کی سوانح لکھنے کے لیے اسکے کلام سے بڑھ کر کوئی شے اسکے سفرِ حیات کی غمازی نہیں کرتی۔ ''دروازہ'' بھی احمد ساقیؔ

کے معمولات اور فکر سے جڑی دستاویز ہے جو زندگی کی ساری حقیقتوں کی نقیب بھی ہے اور اس کی امین بھی اس نے یہ دستاویز کسی خاص نہج پر ترتیب نہیں دی اس لیے اس میں ایک تجریدی کشش ہے جو قاری کی فکر اور جذبے کو مہمیز کرتی اور اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ یوں بھی زندگی اپنی حقیقت میں کوئی مرتب کتاب نہیں ایک تجریدی تصویر ہے جسے ہم اپنی دانش اور فہم کے سہارے عام فہم اور عمومی بنانے کی سعی کرتے ہیں۔

''دروازہ'' حقیقت میں ایک ایسی کتاب ہے جو ماضی، حال اور مستقبل یعنی موجود، غیر موجود اور ناموجود کی دنیاؤں کو ایک دوسری سے الگ اور کبھی ایک دوسری میں مدغم کرتی ہوئی ہمارے اذہان کا حصہ بن جاتی ہے۔ تجربے اور احساس کی شراکت اور ایک موہوم مماثلت ہمیں اس میں ظہور کرتی ہوئی دنیا سے کبھی ہم آہنگ کرتی ہے اور کبھی بیگانہ۔ یہ یگانگت اور یہ مہین حجاب ہی شاعری کی کُنہ، ہے یہی وہ چیزے دیگر ہے جو تخلیقی تجربہ کہلاتی ہے اور جسے چھو کر ایک عام خیال ایک الُوہی ارمغان میں ڈھل جاتا ہے۔

فنی محاسن کی سطح پر اس کتاب کی توصیف کرنا ضروری نہیں بھی ہو تو زبان کی سطح پر اس کی ایک خاص بات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔''دروازہ'' میں کئی جگہوں پر صاف دکھائی دیتا ہے کہ شاعر زبان کے بنے بنائے، سانچے کو بعینہٖ قبول کرنے پر آمادہ نہیں اور اسے اپنے احساس اور خیال کے برجستہ اظہار کے لیے توڑنے یا نیا بنانے پر آمادہ رہتے ہیں۔ یوں بھی یہ قوس وتسنیم میں دھلی ہوئی زبان کا عہد نہیں اور لسانی تشکیلا ت کی تحریک نے شاعر کے لیے کھل کر سانس لینے کی سہولت پیدا کی ہے مگر احمد ساقیؔ کے یہاں یہ عمل کسی تحریک سے وابستگی یا زبان کے عمومی سانچے کے ساتھ تشدّد کا حوالہ بن کر سامنے نہیں آتا بلکہ اپنے احساس کو اس کی خالص ترین صورت میں بیان کرنے کی غرض سے ظہور پاتا ہے، جیسے:-

مجھ کو ان تیز ہواؤں میں جلانا ہے چراغ   چاہے اس کارِ جنوں میں مرا سر لگ جائے
کاش ایسا ہو بدل جائے یہ منظر احمدؔ   لمحہ بھر کو مری بستر پہ کمر لگ جائے

☆☆☆

جہاں میں ہم سا زیاں کار کون ہے احمدؔ   کہ نقدا نقد لیا اور ادھار کرتے رہے

☆☆☆

خوش لباسی سے مرا خوف عیاں ہوتا ہے　　اپنے اندر کبھی جھاڑو نہیں پھیرا میں نے
وہ بھی ہر بار کوئی رستہ بنا لیتا ہے　　باتوں باتوں میں تو اس کو بڑا گھیرا میں نے

☆☆☆

عاشق مزاج ہونا ہوئی جرم تو نہیں　　کیوں دیکھتا ہے مجھ کو تو آنکھیں نکال کر

☆☆☆

یہ چند مثالیں یہ بات واضح کرتی ہیں کہ شاعر کا اپنے موجود اور اپنی زمین سے تعلق کس قدر فطری اور بے ساختہ ہے اور اپنے اظہار کی ندرت کو برقرار رکھنے کے لیے وہ کس نوع کی آزادی سے کام لینے کو تیار رہتا ہے۔ سو احمد ساقی کی ''دروازہ'' ایک خاص طرح کی لسانی بلاغت اور شگفت سے مملو ہے جو فکرِ شعر میں رہنے والوں کو ایک نئی دنیا کی طرف نکلنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

یہ سب ہے مگر یہ سب کچھ ''دروازہ'' کے ابعاد کو جاننے کے لیے کافی نہیں کیونکہ زندگی کی بوقلمونیوں اور جہتوں کی خبر لانے کے لیے اس کی ہر ایک پرت کو کھولنا ضروری ہوتا ہے۔ ''دروازہ'' ایک ایسا تخلیقی دریچہ ہے جس میں جھانک کر ہم اپنے موجود کی حقیقت کو بھی جان سکتے ہیں اور غیر موجود کے اسرار کو بھی۔ آئیے احمد ساقی کی اس دنیا کے گشت کو نکلیں اس یقین کے ساتھ کہ ہم اپنے سے بھی مل سکیں گے اور ایک دوسرے سے بھی۔

غلام حسین ساجدؔ

احمد ساقی کی حس آمیزی

احمد ساقیؔ کی کلاسیکی شائستگی میں گندھی ہوئی غزل کو جب معاصر اردو غزل کے تناظر میں پڑھتا ہوں تو میرزا عبدالقادر بیدل کے یہ اشعار یاد آجاتے ہیں

کردہ ام باز بہ آں گریۂ سودا ، سودا کہ زِ ہراشک زدم برسرِ دریا ، دریا
ساقی امشب چہ جنوں ریخت بہ پیمانۂ ہوش کہ شکستم بہ دل از قلقل مینا ، مینا

☆☆☆

ان میں پیمانۂ ہوش میں ''جنوں'' کی آمیزش نے جو کیفیت پیدا کی ہے۔اس کیف میں احمد ساقیؔ کی غزل آج کی غزل میں اپنا علاحدہ اعتبار رکھتی ہے۔غزل کی کلاسیکی شائستگی اور شاعری کے رچے ہوئے شعور نے ان کے کلام میں ایک حیرت زا فضا پیدا کر دی ہے ان کا لب ولہجہ ایک راز یاب شخص کا سنبھلا ہوا لب ولہجہ ہے۔وہ اظہار حیرت میں چونکانے کی شعوری کوشش سے بہت دور ہیں ان کے اظہار میں ریا کاری اور تصنّع نہیں نہ ہی ان کے لہجے میں گھن گرج اور بلند آہنگی کا تاثر نظر آتا ہے۔ان کے اشعار کی زمینیں اظہار کی فضا میں بڑی معاون ہیں مفاہیم و مطالیب سے آشنا ہونے والے لوگوں کی طرح وہ بڑی سہولت سے اظہار کے مرحلے طے کر لیتے ہیں۔زمینوں کی نادرہ کاری کے سبب ان کی غزلوں کا ماحول تازگی کا حامل نظر آتا ہے۔قافیے کے کلیدی استعمال سے انہوں نے اپنے کلام کے فکری پس منظر کو ہمیشہ پر معنی اور بلیغ رکھنے کی کوشش کی ہے۔قاری ان کی غزل پڑھتے ہوئے صرف کیفیات کی حیرت سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ ان کے مضامین و موضوعات کی بلاغت پر سوچ بچار بھی کرتا ہے شاعر اگر اپنے قاری کو اپنے کلام میں الفاظ کی دروبست سے آگے مفہوم کی گہرائی تک لے جانے میں کامیاب ہو جائے تو یہ اُس کے کلام کے معجز نما ہونے کا ثبوت ہے۔احمد ساقی کی غزل مشاعرے میں جو تاثیر پیدا کرتی ہے اس سے کہیں گہری

تاثیر ان کے کلام کو تخلیے میں پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

احمد ساقی کی غزل کا تجزیہ اُن کے عروضی نظام، شعری زمینوں، قوافی و ردائف، تراکیب، محاسن شعری خصوصاً محاکات اور امیجز وغیرہ کے حوالے سے کریں تو معاصر غزل کے تقابلی تناظر میں ان کی انفرادیت نمایاں نظر آئے گی۔ احمد ساقیؔ کی غزل میں تراکیب کا ایک بلیغ نظام ہے مگر ان کے تلازماتی بہاؤ اور معنوی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا جائے تو ان میں خیال کا ایک سلسلہ نظر آئے گا خصوصًا فارسی اور اردو غزل کے تناظر میں وہ تراکیب اپنے مطلوب مفہوم کے علاوہ بھی بہت سے مفاہیم سے منسلک نظر آتی ہیں۔ مثلاً خیمۂ خاک، اہلِ خاک، دیوارِ ملاقات، ناقۂ بیزار، تختۂ حسرتِ دیدار، حصارِ خوفِ عدم، حدِ امکان، ملبۂ غم، مسندِ دشوار وغیرہ وغیرہ۔

مفاہیم کی بلاغت کے ساتھ اُن کا محاکاتی پہلو جداگانہ لطف رکھتا ہے احمد ساقیؔ کی غزل کی تمثالوں میں ساکن، متحرک، ڈرامائی، مکالماتی امیجز کی کئی دوسری قسمیں فطری انداز میں در آئی ہیں۔ واژہ نامہ ہنر شاعری، (مطبوعہ ایران) میں ذوالقدر میمنت نے تمثالوں پہ بات کرتے ہوئے ''حس آمیزی'' کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ مثلاً سکوتِ سنگیں وغیرہ ایسے امیجز میں باصرہ اور سامعہ یا دوسری حسوں کو آمیز کر کے معنویت کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ معاصر اردو غزل میں احمد ساقیؔ کے ہاں ایسی خوبصورت تمثالیں ہیں جن میں مختلف حسوں کی آمیزش سے بامعنی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کے ہاں دیواریں کلام کرتی ہیں دروازے مکالمہ کرتے ہیں۔ تصویر، نقشِ پا، دریا، پانی، چراغ، راستے، الفاظ۔ ان کے لیے زندہ کرداروں کی طرح ہیں مولانا روم نے کہا تھا۔

نطق باد و نطق آب و نطق گل   ہست محسوسِ حواسِ اہلِ دل

بات شاید (بیدل اور مولانا روم کے حوالے سے بہت بڑی لگے، مبالغے اور تعلّی میں) لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ جب آدمی شعر کی تخلیقی فضا میں داخل ہوتا ہے تو پوری کائنات (اس کی جذبی استعداد کے مطابق) اس سے محوکلام ہو جاتی ہے اس کے لیے پرندے اور درخت بھی انسانوں کی طرح کلام کرتے ہوئے کردار بن جاتے ہیں زیادہ گہرائی میں دیکھنے اور سوچنے والوں کے لیے یہ ہمہ وقتی کیفیت ہوتی ہے جب کہ ہم جیسے غافلوں کے لیے مکالموں کے یہ دریچے کبھی کبھار پل دو پل کو کھلتے ہیں اور ایسی کیفیات کبھی کبھار، کم کم اور ٹوٹ ٹوٹ کر ظاہر ہوتی ہیں اہل جذب کے ساتھ اشیائے کائنات کے مکالے ان کی رازیاب آگہی کے مطابق ہوتے ہیں بقول شخصے:

شرط ہے ساعتِ تخلیق کا جاذب ہونا   صبحِ کاذب میں خیالات کی شبنم ہے بہت

احمد ساقی نے اپنی تخلیقی ساعتوں میں حس آمیزی سے سینکڑوں نادر شعر تخلیق کیے ہیں۔
جس طرح اُن کے پہلے مجموعہ غزل کا سنجیدہ مطالعہ ایسی تمثالوں کی کثرت دکھاتا ہے اسی طرح ان کے دوسرے مجموعے میں بھی ایسے محاکات کی بہتات ہے مجھے ان کی تخلیقی کارکردگی کا سب سے منفرد اور روشن حصہ ان شعروں میں نظر آتا ہے۔ جہاں انہوں نے حس آمیز تمثالوں کی زبان میں گفتگو کی ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھئے جملہ اوصاف غزل اور محاسن شعر کے ساتھ یہ شعر کتنے پُر کیف اور بلیغ ہیں جن میں وہ بے جان چیزوں سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔

رقص کرتی ہوئی لو سر پہ اُٹھا لائی ہے　　سر قلم کر کے چراغوں کے ہَوا لائی ہے

☆☆☆

مجالِ حشر کی جانب رواں دواں ہیں لوگ　　ہر ایک سر پہ مَیں اس کا وبال دیکھتا ہوں
غزل کو لکھ کے اسے بار بار پڑھتا ہوں　　ملول ہو کے مَیں اپنا ملال دیکھتا ہوں

☆☆☆

کیسے تجھے سخن کا مسیحا مَیں مان لوں　　تُو نے تو ایک حرف بھی زندہ نہیں کیا

☆☆☆

مَیں نے جب اس سے کہا دیکھ ذرا پانی میں　　اِک گل تازہ کنول کھلنے لگا پانی میں
کاغذی ناؤ پہ اِک خواب رکھا ایک دِیا　　اور اِک اسم پڑھا چھوڑ دیا پانی میں
ایک درویش سرِ آبِ رواں گزرا تھا　　ڈھونڈتا پھرتا ہوں نقشِ کفِ پا پانی میں

☆☆☆

اس نے دستار کو بھی کاسہ بنا رکھا ہے　　مَیں جسے شاہ سمجھتا تھا گداگر نکلا

☆☆☆

پہلے چپ چاپ مجھے تکتا رہا دروازہ　　جونہی مَیں جانے لگا بول پڑا دروازہ
مَیں جہاں دستکیں دیتا رہا دیوار تھی وہ　　اور جسے سمجھا تھا دیوار وہ تھا دروازہ
جانے کس شخص نے دیوار پہ دستک دی ہے　　کہ اچانک ہی وہاں پھوٹ پڑا دروازہ
یہ وہ دستک ہے کہ دروازہ جسے جانتا ہے　　خود بہ خود یونہی نہیں کھلنے لگا دروازہ
ایک دن بحث چھڑی موت حقیقت کیا ہے　　کچھ نے دیوار کہا کچھ نے کہا دروازہ

☆☆☆

اگرچہ پشت کیے بیٹھا تھا مری جانب   وہ دیکھتا تھا مجھے بار بار شیشے میں

☆☆☆

جب بھی مَیں تیری حقیقت کا طلبگار ہُوا   میرے اندر سے ترا عکس نمودار ہُوا
دُشمنی اپنی جگہ عدل کی مجبوری تھی   مَیں کسی ڈر سے نہیں تیرا طرفدار ہُوا
خوابِ غفلت کی سزا مجھ کو زمانے نے یوں دی   پا بہ زنجیر پڑا تھا مَیں جو بیدار ہُوا

☆☆☆

دوسرے عشق پہ قدغن تو نہیں پر مرے یار   تجھ سا ملتا کوئی مجھ کو تو دوبارہ کرتا

☆☆☆

خلعتِ فقر کا طالب ہوں مگر خواہش دنیا   چپکی رہتی ہے بدن سے کسی پوشاک کی مانند
کس طرح کوئی تراشے گا مجھے دستِ ہنر سے   اب کوئی چاک گھماتا ہی نہیں چاک کی مانند
مَیں کسی اور ہی دنیا میں چلا آیا ہوں احمدؔ   یہ جہاں لگتا نہیں مجھ کو مری خاک کی مانند

☆☆☆

خواب اور سانس تو آئینہ صفت ہوتے ہیں   یہ کہیں ٹُوٹ نہ جائیں مجھے ڈر لگتا ہے
کچھ بھی یاں مفت میسر نہیں دنیا ہے میاں   اب تو عزت کو کمانے پہ بھی زر لگتا ہے

☆☆☆

حدِ امکان سے آگے بسیرا کر لیا ہے   مکاں کی جستجو میں لا مکاں تک آ گیا ہوں

☆☆☆

دل کو یکسوئی کی جانب کھینچتا ہوں بار بار   ''شین'' کا یہ حرف مجھ سے کیوں ''الف'' ہوتا نہیں

☆☆☆

کسی بھی حال میں دل کو تسلی ہی نہیں ہوتی   اِدھر تعمیر کرتا ہے اُدھر مسمار کرتا ہے

☆☆☆

حیرتی ہوں لب تو ہلتے ہیں صدا آتی نہیں   ایسے سناٹے میں لگتا ہے خدا بولے گا بس
غیر کی کوئی جگہ ہے کیا ترے دستور میں   اب یہاں وہ ہی جیئے گا جو ترا ہولے گا بس

☆☆☆

مَیں کان بند بھی کر لوں سنائی دیتا ہے   وہ شخص میری رگوں میں دہائی دیتا ہے

☆☆☆

لرز رہا ہوں ہواؤں کی چیرہ دستی سے   مَیں سایہ دار شجر ہوں سنبھالیے مجھ کو

☆☆☆

یہی مشکل پڑی ہے مجھ پہ آسانی کے ہاتھوں   کہ ارزاں ہو گیا ہوں مَیں فروانی کے ہاتھوں
مَیں اس منہ زور دریا کے کنارے پر کھڑا ہوں   جو پاگل ہو رہا ہے اپنے ہی پانی کے ہاتھوں
جونہی وہ حسنِ مطلق کھل رہا تھا میرے آگے   مَیں پتھرانے لگا تھا اپنی حیرانی کے ہاتھوں

☆☆☆

کسی بھی لمحے کوئی حادثہ ہُوا کہ ہُوا   بہت سے خوف لرزتے جہاں پہ طاری ہیں

☆☆☆

زیست ہچکولے پہ ہچکولے لیے جاتی ہے   جیسے مَیں ناقۂ بیزار پہ آ بیٹھا ہوں
اب گلہ کس سے کروں سوختہ سامانی کا   خود ہی جلتے ہوئے انگار پہ آ بیٹھا ہوں

☆☆☆

بجھتی آنکھوں نے لجاجت سے اجل سے پوچھا   مہرباں تھوڑی سی تاخیر نہیں ہو سکتی؟

☆☆☆

جیسے دریاؤں میں پانی کا گزر رہتا ہے   میرے اندر بھی کوئی محوِ سفر رہتا ہے
کسی دستک سے یہ دیوار بھی کھل سکتی ہے   گرچہ لگتا نہیں، امکان مگر رہتا ہے

☆☆☆

ہجر کی لہر سے جب میرا کنارہ ٹوٹا   میری دہلیز پہ آ کر بڑا رویا دریا
اپنے اندر کسی دریا کی طرح بہتا ہوں   دیکھ کر مجھ کو یونہی تو نہیں بپھرا دریا

☆☆☆

راستہ کوئی درمیانی ہو   جو زمینی نہ آسمانی ہو

☆☆☆

ہر کام کیا مَیں نے سلیقے سے ادب سے   بس عشق ہی کرنا نہیں آیا مجھے ڈھب سے

☆☆☆

ہر ایک شخص مرے سامنے ہوا دیوار   کٹی ہے عمر مری راستہ بناتے ہوئے

☆☆☆

دمِ آخر تھا کوئی بول رہا تھا مجھ میں   ایک دروازہ نیا کھول رہا تھا مجھ میں
درد اتنا کہ لگا سانس اُکھڑ جائے گی   موت کا زہر کوئی گھول رہا تھا مجھ میں

☆☆☆

میری سانسیں ابھی ہموار نہیں ہو پاتیں   دل نئی خواہشیں کاندھے پہ اُٹھا لاتا ہے

☆☆☆

کہاں کہاں سے گزر کر یہاں نہیں پہنچا   مری کہانی پہ اِک داستاں کا غلبہ ہے

☆☆☆

کوئی تصویر ٹھہرتی ہی نہیں آنکھوں میں   بہتے پانی میں فقط عکس رواں ملتا ہے

☆☆☆

لاشے پڑے تھے غار دہانے کے آس پاس   اِک معرکہ ہوا تھا خزانے کے آس پاس

☆☆☆

جو تھا آساں وہ کہہ دیا مَیں نے   در حقیقت تھی اَن کہی مشکل
دل جگر خوں کیے بغیر احمدؔ   مجھ کو لگتی ہے شاعری مشکل

☆☆☆

اب مرزا عبدالقادر بیدل کے شروع میں دیئے گئے اشعار میں سے یہ شعر دوبارہ دیکھئے۔

ساقی امشب چہ جنوں ریخت بہ پیمانۂ ہوش   کہ شکستم بہ دل از قلقل مینا ، مینا

احمد ساقیؔ نے ہوش کے پیمانہ میں کس جنون کی آمیزش کر دی ہے جس سے

کہ شکستم بہ دل از قلقل مینا مینا۔۔ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔سو یہ سارا تاثر اور تناظر ہوش سے جنوں آمیز کرنے یا حس آمیزی کا ہے جس نے احمد ساقیؔ کی غزل کو یہ اختصاص بخشا ہے۔

یہ کام ایک طویل وضخیم مقالے کا متقاضی ہے جس کی یہ تحریر متحمل نہیں ہو سکتی، سر دست ان کی غزل کے حوالے سے یہ چند صفحے ایک مجموعی تاثر کی نشاندہی ہے یہ نشاندہی بھی محض ایک کوشش ہے۔

ڈاکٹر ریاض مجید

محبتوں کا سفیر مستعصم

پچھلے دنوں نہایت پیارے دوست محمد مستعصم چودھری سے بات ہوئی جو آج کل امریکہ کی ریاست فلوریڈا کے شہر میامی میں مقیم ہے۔میرے نئے شعری مجموعے ''دروازہ'' کی اشاعت کی بات چھڑی تو کہنے لگا،ساقی یار! حفیظ تائب صاحب نے میری ایک غزل کی اصلاح کی تھی جو ان کے قلم سے لکھی ہوئی میرے پاس موجود ہے۔کیا یہ ممکن ہے کہ وہ غزل آپ کی کتاب کا حصہ بن سکے؟ میں نے جھٹ سے کہا! میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہوگا کہ مدّاحِ رسول ﷺ حفیظ تائب رحمہ اللہ کے ہاتھوں سے لکھی ہوئی غزل میری کتاب کا حصہ بنے۔ یہ تو ایک تبرُک ہے براہِ محبت مجھے واٹس ایپ کردو۔

1977ء سے اُدھر کی بات ہے کہ یونیورسٹی اورینٹل کالج سے ہمارا سامنا ہوا،سرخ رنگ سے نہلائی ہوئی قدیم طرز کی پرشکوہ دومنزلہ عمارت جس کے برآمدوں کے سرخ ستونوں کو رنگ برنگے آنچل شوخ وشنگ بنائے ہوئے تھے،ایسے لگتا تھا کہ یہاں خواب بستے ہیں۔ان دنوں جامعہ پنجاب ''رائٹ'' اور ''لیفٹ'' کی سیاست کا اکھاڑہ تھی ''ایشیا سبز ہے''،''ایشیا سرخ ہے'' کے نعروں کی گونج ہمہ وقت سماعتوں سے ٹکراتی۔تشدد،مار دھاڑ اور فائرنگ اس پر آشوب سیاست کا طرۂ امتیاز تھا۔ طلبہ کے دو دھڑوں نے جن کو سیاسی جماعتوں کی پشت پناہی حاصل تھی، جامعہ پنجاب کو دو حصوں میں منقسم کر رکھا تھا۔ نیو کیمپس پر اسلامی جمعیت طلبہ اور اولڈ کیمپس پر پیپلز سٹوڈنٹس فیڈریشن کا رسوخ تھا۔بلکہ قبضہ کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔

میں،اسلامیہ کالج فیصل آباد،گورنمنٹ کالج دھوبی گھاٹ فیصل آباد اور میونسپل کالج اوکاڑا سے طلبہ یونینز کے انتخابات لڑتا لڑاتا یونیورسٹی اورینٹل کالج شعبہ عربی میں آداخل ہوا۔اسلام سے محبت گھریلو تربیت کی وجہ سے رگ وپے میں رچی بسی تھی اس لیے ''لیفٹ'' کا ہم خیال ہونا بعید از قیاس تھا۔ٹھان رکھی تھی کہ اب صرف پڑھنا ہے۔۔۔۔۔۔مگر ''یار لوگوں'' کو ایسے خوف زدہ ماحول

میں جب جنرل سیکرٹری کے لیے مناسب اُمیدوار نہ ملا تو قرعہ ہمارے نام نکل آیا۔ یقیناً اس کی وجہ ہمارا وجیہ اور اچھا مقرر ہونا ہی نہیں تھا۔ ہم ''ڈنڈی پٹی'' قائم اور بزعمِ خویش کچھ نڈر فائٹر بھی تھے۔ ''لیفٹ'' کے اس گڑھ میں ہم سے بہتر اور کوئی اُمیدوار ''رائٹ'' کی نظر میں نہیں تھا۔ سو ہمیں میدان میں اُترنا پڑا۔ (اور کامیاب بھی ہوئے)

اورینٹل کالج کے عقب میں ''وولنر ہاسٹل'' کمرہ نمبر 6 میرا مسکن تھا۔ ایک سنہرے دن، مَیں اور میرے دیرینہ دوست محمد حمزہ گپ شپ میں مصروف تھے کہ سانولی رنگت اور چڑھی ہوئی آنکھوں والا ایک لمبا تڑنگا نوجوان مسکراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ تھا، ثروت صدیقی، معروف باکسر، شعبہ اُردو کا سابقہ طالب علم۔ اس نے نہ صرف دوستی پر ایک لمبا چوڑا لیکچر دیا بلکہ ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بھی بڑھایا۔ ہم اپنی ضرورت کے مطابق اس کی زد میں آ گئے۔ ثروت کا ایک احسان میں زندگی بھر نہیں بھلا سکوں گا کہ اس نے ایک بہت ہی اجلے شخص محمد مستعصم چودھری سے میری ملاقات کروادی اور آج کے دن تک اس کے خلوص اور محبت کی بدولت دوستی کا سلسلہ قائم و دائم ہے۔ مستعصم اپنے دور کا ممتاز باکسر جس نے مختلف ممالک میں نہ صرف وطن عزیز کی نمائندگی کی بلکہ بہت سے میڈلز بھی جیتے۔ ہمارے اصرار پر مستعصم نے ایم۔اے پنجابی میں داخلہ لے لیا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب جنرل ضیاء مرحوم کا مارشل لا تھا اور طلبہ یونینز پر پابندی تھی۔ مستعصم نے ہم نصابی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے ''لائل فرینڈز ایسوسی ایشن'' کی بنیاد رکھ دی۔ جس کا چیئرمین وہ خود ہی تھا۔ اورینٹل کالج کے رومانوی ماحول نے اس باکسر کو شاعر بنا دیا۔ آج بھی اس کالج کی فضاؤں میں اس کی نظموں ''سپنا'' اور ''حسین چہروں'' کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اس کتاب کی طباعت میں اس کا جوش و خروش قابل ستائش ہے۔ میرا یہ یار جہاں بھی رہے ربِ کائنات کی حفظ و امان میں رہے۔ آمین۔

حفیظ تائب رحمہ اللہ کے قلم سے مستعصم چودھری کی اصلاح شدہ غزل کا عکس

غزل

محمد مستعصم چودھری

کاش اِس عاجز کو بھی کر دے غنی تیرا خلوص
زندگی مجھ سے گریزاں زندگی تیرا خلوص

بات تو جب ہے کہ جلتی روح کو بخشے سکوں
میرے گھر کے چاند! تیری چاندنی، تیرا خلوص

تیرگی کو میں اُجالا مان لوں پاؤں اگر
روشنی تیری نظر کی روشنی تیرا خلوص

میں نے سب کچھ تج دیا اک تیری آہٹ کے لیے
روحِ نغمہ ہے سراپا خامشی تیرا خلوص

میں طلب کی سرحدوں کو پھاند جاؤں گر ملے
آگہی تیری چمک، خود آگہی تیرا خلوص

میں تو اُڑ جاتا تھا لے کر ساتھ زنجیرِ رسوم
بن گیا ہے میری بے بال و پری تیرا خلوص

بے نیازِ خواجگی پھر کیوں نہ مستعصم ہو پھر
مجھ کو مل جائے اگر آسودگی تیرا خلوص

حمد

بہار لطف نظارے جھلک جھلک اس کی
جہانِ رنگ میں ساری دھنک دھنک اس کی

کنول ، گلاب ، چنبیلی یہ رات کی رانی
چمن کے سارے گلوں کی مہک مہک اس کی

یہ آفتاب قمر اور برق برق سحاب
یہ جھلملاتے ستارے چمک دمک اس کی

نشاطِ نغمہ اور آواز کا ترنّم بھی
حسین لہجوں کی ساری کھنک کھنک اس کی

بدن کی کارہ گری کے سبھی نشیب و فراز
خرامِ ناز کی ساری لہک لہک اس کی

سخن طراز ہے دنیا بزعمِ حسنِ خیال
مگر ہے نکتہ وروں کی چہک چہک اس کی

ہر ایک سانس اسی کی نگاہداشت میں ہے
ہر اک وجود میں خنداں پلک جھپک اس کی

کوئی شریک نہیں اختیار میں اس کا
یہ کائنات ازل سے ابد تلک اس کی

چہار سمت اسی کی ثنا و تعریفیں
تمام حمد بہ خاک اور فلک فلک اس کی

❖❖❖

نعت

مدینہ پیشِ نظر ہے، خیال رکھیے گا
خیال محوِ سفر ہے، خیال رکھیے گا

یہ شہر شہر نہیں مثل آبگینہ ہے
یہاں حضور ﷺ کا گھر ہے، خیال رکھیے گا

چہار سمت پڑے ہیں عقیدتوں کے گلاب
یہ قدسیوں کا نگر ہے، خیال رکھیے گا

جہانِ آب و گل اپنے معاملات کے ساتھ
نبی ﷺ کے زیرِ اثر ہے، خیال رکھیے گا

حسنؓ حسینؓ علیؓ فاطمہؓ جنابِ رسول ﷺ
سبھی کی ایک نظر ہے، خیال رکھیے گا

درِ رسول ﷺ پہ محتاط گفتگو کیجئے
نبی ﷺ کے ساتھ عمرؓ ہے، خیال رکھیے گا

بروزِ حشر شفاعت کی التجا ہے مری
غلام خاک بسر ہے، خیال رکھیے گا

نبی ﷺ کی نعت عطا ہے عطائے ربِّ کریم
اسی کا کارِ ہنر ہے، خیال رکھیے گا

قدم قدم پہ جزا اور قدم قدم پہ سزا
یہ نیتوں کا ثمر ہے، خیال رکھیے گا

❖❖❖

◎

مَیں نے جب اُس سے کہا دیکھ ذرا پانی میں
اک گل تازہ، کنول کھلنے لگا پانی میں

کاغذی ناؤ پہ اک خواب رکھا ایک دِیا
اور اک اسم پڑھا چھوڑ دیا پانی میں

ایک درویش سرِ آبِ رواں گزرا تھا
ڈھونڈتا پھرتا ہوں نقشِ کفِ پا، پانی میں

پہلے مَیں چلتا رہا دیر تلک چلتا رہا
پھر مرا اشک گرا پھر مَیں گرا پانی میں

سر پٹختے ہوئے دریا کو جو دیکھا تو لگا
کوئی آسیب ہے یا کوئی بَلا پانی میں

ایک سیلاب اُمڈ آیا تری یادوں کا
اور مَیں دیر تلک بہتا رہا پانی میں

ایسے روشن ہے مری آنکھ میں اِک خوابِ حسیں
جھلملاتا ہو کوئی جیسے دِیا پانی میں

مَیں تضادات کے گارے سے بنا ہوں احمدؔ
نور سے خاک ہُوا آگ ہُوا پانی میں

❖❖❖

◎

دھوپ کا عکس کڑی دھوپ سے بڑھ کر نکلا
مَیں جسے آئنہ سمجھا تھا وہ پتھر نکلا

لوگ دکھ درد بھی تنہا نہیں سہنے دیتے
میرے گھر میں جو تماشا تھا وہ گھر گھر نکلا

دیکھ کر چاند تلاطم ہے بپا سینے میں
مَیں سمجھتا تھا جسے دل وہ سمندر نکلا

اُس نے دستار کو بھی کاسہ بنا رکھا ہے
مَیں جسے شاہ سمجھتا تھا گداگر نکلا

ایک دن خود سے تقابل کیا مَیں نے اپنا
میرے اندر کا جو انسان تھا بہتر نکلا

منکشف ہونے لگا سرِّ نہاں بھی مجھ پر
جونہی سینے سے مرے وہم کا خنجر نکلا

عمر بھر جس کو تلاشا تھا سرِ کون و مکاں
وہی مطلوب مری خاک کے اندر نکلا

اُس کی یادوں سے بڑی معرکہ آرائی ہوئی
پھر کہیں جا کے مرے دل سے وہ پیکر نکلا

خود پسندی کا نشہ ایسا نشہ ہے احمدؔ
مَیں نے جس جس کو بھی دیکھا وہی خوگر نکلا

❖❖❖

◎

پہلے چپ چاپ سے مجھے تکتا رہا دروازہ
جونہی مَیں جانے لگا بول پڑا دروازہ

اِک یہی بات سمجھ میں نہیں آئی اب تک
کیوں پلٹ آیا تھا مَیں جب وہ کھلا دروازہ

پہلے ہم دونوں بڑی دیر تلک ہنستے رہے
بات فرقت کی چلی رونے لگا دروازہ

آج تک بھول نہیں پایا مَیں ان تینوں کو
وہ محلہ وہ گلی اور ترا دروازہ

مَیں جہاں دستکیں دیتا رہا دِیوار تھی وہ
اور جسے سمجھا تھا دِیوار وہ تھا دروازہ

جانے کس شخص نے دِیوار پہ دستک دی ہے
کہ اچانک ہی وہاں پھوٹ پڑا دروازہ

یہ وہ دستک ہے کہ دروازہ جسے جانتا ہے
خود بہ خود یونہی نہیں کھلنے لگا دروازہ

بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ کچھ یاد نہ تھا
اور تو اور مجھے بھول گیا دروازہ

کئی دروازے نکل آتے تھے دروازے سے
ایسے لگتا ہے کہ اب بانجھ ہوا دروازہ

ایک دن بحث چھڑی موت حقیقت کیا ہے
کچھ نے دیوار کہا کچھ نے کہا دروازہ

رائگاں عمر کٹی کُھل نہ سکا رازِ حیات
زندگی ختم ہوئی تب یہ کُھلا دروازہ

خوابِ غفلت میں رہا توبہ کا آیا نہ خیال
اور جب آنکھ کُھلی بند ہُوا دروازہ

ضبط اتنا بھی مرے بس میں نہیں تھا احمدؔ
حبس جب حد سے بڑھا توڑ دیا دروازہ

❖❖❖

◎

کئی پڑے ہیں فریبی حصار شیشے میں
اٹھا کے سنگِ گراں کوئی مار شیشے میں

جہانِ تازہ کی تسخیر بعد میں کرنا
تُو اپنے دل کو تو پہلے اُتار شیشے میں

یہ کس کا عکس فروزاں ہے بر دلِ درویش
دھمال کرنے لگی ہے بہار شیشے میں

کبھی تو آ دلِ مجذوب کی تسلّی کو
مزید بڑھنے لگا انتظار شیشے میں

لگا کے نعرۂ مستی تلاشِ ہستی میں
ہُوا ہے غرق کوئی مے گسار شیشے میں

تُو خود کو کھوج ذرا اور آئنے میں دیکھ
پڑے ہیں عیب ترے بے شمار شیشے میں

اگرچہ پشت کیے بیٹھا تھا مری جانب
وہ دیکھتا تھا مجھے بار بار شیشے میں

پرانے خال وخد اپنے نکھارتے ہوئے وہ
ہزار بار ہُوا اشک بار شیشے میں

سنور رہا تھا مقابل تھے آئنے احمدؔ
مجھے بھی اس نے کیا تھا شمار شیشے میں

❖❖❖

◎

ہم اہلِ خاک عجب ساختہ یقیں پر ہیں
ہم آسمان کے مارے ہوئے زمیں پر ہیں

جو پڑھ سکو تو پڑھو میری داستانِ غم
لکیریں ہاتھ پہ اور سلوٹیں جبیں پر ہیں

ابھی تو ''لا'' ہی کہا تھا کہ کٹ گئی گردن
کھلا یہ بھید کہ جھگڑے سبھی ''نہیں'' پر ہیں

مصالحت تو ہوئی پر منافقت کے عوض
قریب ہو تو گئے فاصلے وہیں پر ہیں

وہ جن کو دیکھ کے نظریں ادب سے جھک جائیں
ابھی وہ لوگ جہاں میں کہیں کہیں پر ہیں

ہم ایسی قوم کو ادراک ہی نہیں احمدؔ
ہمارے پاس نہ دنیا رہی نہ دیں پر ہیں

❖❖❖

◎

جب بھی مَیں تیری حقیقت کا طلبگار ہُوا
میرے اندر سے ترا عکس نمودار ہُوا

دُشمنی اپنی جگہ عدل کی مجبوری تھی
مَیں کسی ڈر سے نہیں تیرا طرفدار ہُوا

منزلِ شوق مرے سامنے دو گام پہ تھی
اشتیاق اتنا کہ چلنا مجھے دشوار ہُوا

میری جب آنکھ کھلی حکم ہُوا ہجرت کا
باقی جو کچھ بھی ہُوا وہ پسِ دیوار ہُوا

آنے والی سبھی آفات کی تھی اس پہ نظر
سب سے اونچا جو مکاں تھا وہی مسمار ہُوا

خوابِ غفلت کی سزا مجھ کو زمانے نے یوں دی
پا بہ زنجیر پڑا تھا مَیں جو بیدار ہُوا

دوست احباب سبھی قتل پہ خاموش رہے
میرا قاتل ہی فقط میرا عزادار ہُوا

جس نے اپنی جگہ خود ہی بنا لی احمدؔ
جب ہواؤں سے دِیا برسرِ پیکار ہُوا

❖❖❖

◎

تیری توہین بھلا کیسے گوارا کرتا
مر نہ جاتا مَیں اگر تجھ سے کنارا کرتا

ایسی آشفتہ سری، سنگ طلب ہو جیسے
تُو شبِ ہجر جو آتا تو نظارہ کرتا

زندگی تُو مجھے ہمراہ تو لے کر چلتی
دوست بن کر مَیں ترے بوجھ اتارا کرتا

تُو نے اتنی بھی اجازت نہیں بخشی تھی مجھے
مَیں سرِ عام ترا نام پکارا کرتا

بنتِ حوّا جو نہ ہوتی تو یہ اِبنِ آدم
آب و دانے پہ فقط کیسے گزارا کرتا

دوسرے عشق پہ قدغن تو نہیں پر مرے یار
تجھ سا ملتا کوئی مجھ کو تو دوبارہ کرتا

اتنی فرصت ہی کہاں مجھ کو میسّر تھی کہ مَیں
اپنی قسمت کے خد و خال سنوارا کرتا

عشق نے ہاتھ مرے باندھے ہوئے تھے احمدؔ
اپنے قاتل کی طرف کیسے اشارہ کرتا

❖ ❖ ❖

◎

ہم کبھی آگ تھے جو بجھ کے ہوئے راکھ کی مانند
وقت کے آگے پڑے ہیں خس و خاشاک کی مانند

خلعتِ فقر کا طالب ہوں مگر خواہش ِ دنیا
چپکی رہتی ہے بدن سے کسی پوشاک کی مانند

کس طرح کوئی تراشے گا مجھے دستِ ہنر سے
اب کوئی چاک گھماتا ہی نہیں چاک کی مانند

اپنے اندر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہم کو
دیکھتے ہیں جہاں کو دیدۂ اِدراک کی مانند

سر کچلنے کے علاوہ کوئی رستہ ہی نہیں تھا
وہ لڑا مجھ سے کسی مارِ خطر ناک کی مانند

مَیں کسی اور ہی دنیا میں چلا آیا ہوں احمدؔ
یہ جہاں لگتا نہیں مجھ کو مری خاک کی مانند

❖❖❖

◎

نہ کوئی چھاؤں ہے اس کی نہ ثمر لگتا ہے
اس شجر پر کسی سائے کا اثر لگتا ہے

خواب اور سانس تو آئینہ صفت ہوتے ہیں
یہ کہیں ٹوٹ نہ جائیں مجھے ڈر لگتا ہے

کچھ بھی یاں مفت میسّر نہیں دنیا ہے میاں
اب تو عزت کو کمانے پہ بھی زر لگتا ہے

اُدھڑی اُدھڑی ہے مری کھال نزاری ہے بدن
یہ تو ہجرت کا مجھے رختِ سفر لگتا ہے

ایسی دیوار سے کب تک کوئی سر کو پھوڑے
جس میں کھڑکی نہ دریچہ نہ ہی در لگتا ہے

کس قدر پست مکینوں کی ہے بستی احمدؔ
مَیں جو اُٹھتا ہوں تو چھت سے مرا سر لگتا ہے

❖❖❖

◎

یہی مشکل پڑی ہے مجھ پہ آسانی کے ہاتھوں
کہ ارزاں ہو گیا ہوں مَیں فراوانی کے ہاتھوں

مَیں اُس منہ زور دریا کے کنارے پر کھڑا ہوں
جو پاگل ہو رہا ہے اپنے ہی پانی کے ہاتھوں

جونہی وہ حسنِ مطلق کُھل رہا تھا میرے آگے
مَیں پتھرانے لگا تھا اپنی حیرانی کے ہاتھوں

مرے بیتے دنوں کی اک یہی تو ہے نشانی
کہ دانائی ملی ہے مجھ کو نادانی کے ہاتھوں

ترے غم نے پلٹ ڈالی ہے کایا میرے دل کی
خوشی ملنے لگی ہے اب پریشانی کے ہاتھوں

یہ ممکن تھا کہ اس کو بھی رہائی مل ہی جاتی
مگر مارا گیا وہ اپنی سلطانی کے ہاتھوں

تمہارے عشق نے مجھ کو سنبھالا تھا وگرنہ
گراں ہونے لگا تھا اپنی ارزانی کے ہاتھوں

گزشتہ شب تری یادوں کے بادل کُھل کے برسے
ٹپکنے لگ پڑی آنکھیں بھی طغیانی کے ہاتھوں

❖❖❖

◎

رقص کرتی ہوئی لَو سر پہ اٹھا لائی ہے
سر قلم کر کے چراغوں کے ہَوا لائی ہے

ٹیڑھی میڑھی سی لکیروں کو سجا لائی ہے
یہ ہتھیلی بھی مرے واسطے کیا لائی ہے

میری اوقات ہی کیا تھی کہ سراہا جاتا
مجھ کو مسند پہ بزرگوں کی دعا لائی ہے

پہلے وہ حسن کو لفظوں میں بیاں کرتی رہی
بعد ازاں اپنی ہی تصویر اٹھا لائی ہے

مَیں کسی اور کی سنتا ہی کہاں تھا مرے عشق
مجھ کو اس دشت میں تیری ہی صدا لائی ہے

مَیں جو سردار نہ ہوتا تو مَیں مارا جاتا
میری دستار مرے سر کو بچا لائی ہے

اب خدا جانتا ہے کس کا مقدّر یہ بنے
تیری دہلیز تلک مجھ کو قضا لائی ہے

خیمۂ خاک میں بیٹھا ہوں مَیں گم صم احمدؔ
جستجو چاروں طرف مجھ کو گھما لائی ہے

❖❖❖

◎

آرزو تیری محبت کی جہاں رہتی ہے
ایک بارات ستاروں کی وہاں رہتی ہے

جانتا ہوں تُو مری شہ رگِ جاں ہے پھر بھی
تجھ سے ملنے کی تڑپ دل میں جواں رہتی ہے

شیشۂ دل میں ترا عکس ٹھہر جائے تو
پھر کسی اور کی حسرت ہی کہاں رہتی ہے

شعر کہنے کا سلیقہ بھی بدل جاتا ہے
عشق ہو جائے طبیعت بھی رواں رہتی ہے

ذائقہ پہلی محبت کا کبھی مٹتا نہیں
خواہشِ تشنہ طلب وردِ زباں رہتی ہے

جانے کیا سوچتا ہوگا وہ بچھڑ کر احمدؔ
اک کسک ہے جو مرے دل میں نہاں رہتی ہے

❖❖❖

◎

زمیں کو چھوڑ کر اب آسماں تک آ گیا ہوں
مَیں اپنی ذات کے پیچھے کہاں تک آ گیا ہوں

حدِ امکان سے آگے بسیرا کر لیا ہے
مکاں کی جستجو میں لامکاں تک آ گیا ہوں

وہ جس کے جبر کے بارے صحیفوں میں لکھا تھا
مجھے لگتا ہے مَیں ایسے جہاں تک آ گیا ہوں

مجھے اب اپنی مٹی سے بھی گھن آنے لگی ہے
مَیں تیری چاہ میں دُنیا کہاں تک آ گیا ہوں

تمہارے درد کا احساس اتنا بڑھ گیا ہے
حصارِ ضبط سے آہ و فغاں تک آ گیا ہوں

مرے کردار کو توسیع بخشی ہے خدا نے
کہانی سے نکل کر داستاں تک آ گیا ہوں

محبت کی کہانی ساری دہرائی ہے احمدؔ
جہاں بچھڑے تھے ہم دونوں وہاں تک آ گیا ہوں

❖ ❖ ❖

◎

کوئی رستہ بناتا ہے کوئی دِیوار کرتا ہے
جسے جو اچھا لگتا ہے وہ کاروبار کرتا ہے

وہ ظالم میری کمزوری پہ رکھتا ہے نظر اپنی
جہاں پر زخم ہوتا ہے وہیں پر وار کرتا ہے

مَیں اتنا فاصلہ تجھ سے بڑھا لوں گا غنیمِ جاں
مَیں دیکھوں گا ترا جادو کہاں تک مار کرتا ہے

کسی بھی حال میں دل کو تسلّی ہی نہیں ہوتی
اِدھر تعمیر کرتا ہے اُدھر مسمار کرتا ہے

اگرچہ ظاہری آثار سب مثبت ہی لگتے ہیں
یہ دل سارے تناظر سے مگر انکار کرتا ہے

زباں ہر شخص کا خود ہی تعارف پیش کرتی ہے
ہر اِک انسان اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے

یہ دل مشکل پسندی کا ہی عادی ہو گیا احمدؔ
جو ناہموار ہوتا ہے اسے ہموار کرتا ہے

❖❖❖

◎

احتیاط اتنی زندگی مشکل
مجھ پہ کیسی یہ آ پڑی مشکل

شہر میں وہ اکیلا رہ جاتا
مجھ کو لاحق تھی بس یہی مشکل

جو تھا آساں وہ کہہ دیا مَیں نے
در حقیقت تھی اَن کہی مشکل

تیسرا راستہ دِکھائی دے
زِیست مشکل ہے موت بھی مشکل

مرنے والوں سے جا کے پوچھے کوئی
کتنی ہوتی ہے جاں کنی مشکل

محرمِ راز کیا تلاشیں ہم
ہم کلامی بھی ہو گئی مشکل

علم و دانش میں فرق اتنا ہے
علم آساں ہے آگہی مشکل

اس نے ترچھی نظر سے جو دیکھا
سانس لینی بھی ہو گئی مشکل

دل جگر خوں کیے بغیر احمدؔ
مجھ کو لگتی ہے شاعری مشکل

❖❖❖

◎

اب اور کیا کہیں اس زندگی کی بابت ہم
بس اک سراب سے کرتے رہے ہیں الفت ہم

کوئی دھکیل رہا ہے ہمیں تواتر سے
بھگت رہے ہیں لگاتار اک اذیّت ہم

مرے خیال میں ہم ٹوٹنے سے بچ جاتے
نکال لیتے اگر درمیانی صورت ہم

ہمیں ہر ایک نے اپنی نظر سے دیکھا ہے
کہیں تھے شوقِ محبت کہیں ضرورت ہم

تمہی تو محرمِ رازِ دلِ شکستہ ہو
تمہارے سامنے کیونکر کریں حکایت ہم

وہ اپنی کم سنی سے فائدہ اٹھاتا ہے
یونہی تو دیتے نہیں عشق میں سہولت ہم

بدل کے بھیس تلاشِ خدا میں نکلے ہیں
بزعمِ خویش ہوئے مائل حقیقت ہم

بہت سے مسئلے درپیش تھے ہمیں احمدؔ
نہیں تو کرتے دل و جان سے محبت ہم

❖❖❖

◎

مَیں کان بند بھی کرلوں سنائی دیتا ہے
وہ شخص میری رگوں میں دُہائی دیتا ہے

بس اِک خدا ہے جو کرتا ہے مبتلائے ھموم
فقط وہی ہے جو ان سے رہائی دیتا ہے

کمال رتبہ ودیعت کیا گیا ہے اسے
وہ بندگانِ خدا کو خدائی دیتا ہے

بگڑ رہا ہے توازن جہانِ فانی کا
ہر ایک زاویہ ٹیڑھا دکھائی دیتا ہے

مجھے یہ راز نہیں عشق ہی وہ رہبر ہے
نئے جہان تلک جو رسائی دیتا ہے

اسے بھی شوق ہے یوسف کی راہ چلنے کا
خموش رہ کے وہ اپنی صفائی دیتا ہے

جسے طلب ہو رہِ مستقیم کی احمدؔ
ہر ایک ذرّہ اسے رہنمائی دیتا ہے

❖❖❖

◎

فریب کھاتے رہے اعتبار کرتے رہے
گلاب موسموں کا انتظار کرتے رہے

تمہاری یاد کے گلشن سے پھول چُن چُن کر
خزاں نژاد رتوں کو بہار کرتے رہے

فراقِ یار میں گن گن کے دن گزارے ہیں
شبِ وصال ترا انتظار کرتے رہے

ہمی نے پیدا کیے تھے پیمبری کے جواز
خدا سے شرک کیا بار بار کرتے رہے

گناہگار بھی ایسے کہ شرم آتی ہے
ہم اپنی مٹی سے ہی کاروبار کرتے رہے

بدن کو صاف رکھا خوش لباس کہلائے
ہم اپنی روح مگر داغدار کرتے رہے

قدم قدم پہ ہمیں سختیوں سے پالا پڑا
عجیب راستے ہم اختیار کرتے رہے

ہمارے دوست بہت ہی بلند ہمّت تھے
بچا بچا کے نظر ہم پہ وار کرتے رہے

جہاں میں ہم سا زیاں کار کون ہے احمدؔ
کہ نقدا نقد لیا اور اُدھار کرتے رہے

❖❖❖

◎

یہ ہی برا کیا جو تماشا نہیں کیا
مَیں نے تمہارے ساتھ یہ اچھا نہیں کیا

صحرا کی دھوپ ، حدّتِ احساس اور مَیں
ہم پر کسی بھی پیڑ نے سایہ نہیں کیا

مَیں نے تو ٹھان لی تھی تلافی کروں گا مَیں
تُو نے ہی اپنے دل کو کشادہ نہیں کیا

پردہ نشین ہیں سبھی روشن خیال لوگ
گرچہ کسی بھی شخص نے پردہ نہیں کیا

کتنے حوادثاتِ زمانہ گزر گئے
ہم نے کسی کے سامنے شکوہ نہیں کیا

کیسے تجھے سخن کا مسیحا مَیں مان لوں
تُو نے تو ایک حرف بھی زندہ نہیں کیا

❖❖❖

◎

حصارِ خوف عدم سے نکالیے مجھ کو
حیاتِ خضر کے سانچے میں ڈھالیے مجھ کو

غریقِ بحرِ ہوس ہوں کوئی سبیل نہیں
بدستِ موجۂ تاباں اُچھالیے مجھ کو

لرز رہا ہوں ہواؤں کی چیرہ دستی سے
مَیں سایہ دار شجر ہوں سنبھالیے مجھ کو

دبا ہُوا ہوں کہیں ملبۂ عناصر میں
مَیں اصل رازِ نہاں ہوں کھنگالیے مجھ کو

گدائے عشق ہوں، انکار آپ کا حق ہے
مگر سلیقے قرینے سے ٹالیے مجھ کو

❖❖❖

◎

جب سے دیکھا رخِ گل رنگ یہ تیرا مَیں نے
شام دیکھی ہے نہ دیکھا ہے سویرا مَیں نے

خوش لباسی سے مرا خوف عیاں ہوتا ہے
اپنے اندر کبھی جھاڑو نہیں پھیرا مَیں نے

وہ بھی ہر بار کوئی رستہ بنا لیتا ہے
باتوں باتوں میں تو اُس کو بڑا گھیرا مَیں نے

نوچتا رہتا ہوں زخموں کو بڑی وحشت سے
دشت میں جب سے کیا آکے بسیرا مَیں نے

جانے کیوں راکھ نہیں ہوتا یہ جل کر احمدؔ
عمر بھر ڈھیروں جلایا ہے اندھیرا مَیں نے

❖❖❖

◎

جو لوگ حرص و ہوس کے یہاں پجاری ہیں
مرے حساب میں عقل و خرد سے عاری ہیں

کسی بھی لمحے کوئی حادثہ ہُوا کہ ہُوا
بہت سے خوف لرزتے جہاں پہ طاری ہیں

ستمگری کے تماشے نئے تماشے نہیں
یہ سلسلے تو زمیں پر ازل سے جاری ہیں

ترے گلابوں پہ آ کر جو بیٹھ جاتی ہیں
تجھے خبر نہیں وہ تتلیاں ہماری ہیں

ابھی تو رزق کی تولید ہونا باقی ہے
زمیں پہ کتنی اراضی ابھی کنواری ہیں

تجھے خبر نہیں مَیں نے تری محبت میں
دل و نگاہ کی کچھ بازیاں بھی ہاری ہیں

جونہی مَیں دریا میں اترا تو یہ کھلا احمدؔ
کہ سنگریزے بھی میرے بدن سے بھاری ہیں

❖❖❖

◎

جب سے احساس کی دیوار پہ آ بیٹھا ہوں
مَیں کسی مسندِ دشوار پہ آ بیٹھا ہوں

زیست ہچکولے پہ ہچکولے لیے جاتی ہے
جیسے مَیں ناقۂ بیزار پہ آ بیٹھا ہوں

اب گلہ کس سے کروں سوختہ سامانی کا
خود ہی جلتے ہوئے انگار پہ آ بیٹھا ہوں

ہر گھڑی مجھ کو لڑھک جانے کا اندیشہ ہے
جانے کیوں گنبدِ کہسار پہ آ بیٹھا ہوں

موند سکتا ہی نہیں آنکھ کسی حالت میں
تختۂ حسرتِ دیدار پہ آ بیٹھا ہوں

کشمکش دیکھ کے اندر کی کبھی سوچتا ہوں
مَیں کسی جادۂ انکار پہ آ بیٹھا ہوں

❖❖❖

◎

جس طرح روح کی تعبیر نہیں ہو سکتی
جذبۂ عشق کی تفسیر نہیں ہو سکتی

بجھتی آنکھوں نے لجاجت سے اَجل سے پوچھا
مہرباں تھوڑی سی تاخیر نہیں ہو سکتی ؟

کتنے سفّاک خدوخال نظر آتے ہیں
ایسی انسان کی تصویر نہیں ہو سکتی

یہ غلامی تو مری ذات کے اندر ہے میاں
اس کا باعث کوئی زنجیر نہیں ہو سکتی

جرم کے واسطے لازم ہے شہادت کوئی
دل کے حالات پہ تعزیر نہیں ہو سکتی

ہم نے طبقوں میں خود انسان کو تقسیم کیا
دستِ قدرت کی یہ تحریر نہیں ہو سکتی

اس عمارت کو زمیں بوس ہی کرنا ہوگا
ورنہ یاں پر نئی تعمیر نہیں ہو سکتی

دل کو چھو کر جو زباں پر نہیں آتے احمدؔ
ایسے الفاظ میں تاثیر نہیں ہو سکتی

❖❖❖

◎

نام آویزاں ہے اک تیری جبیں پر احمدؔ
اب یقیں کون کرے تیری "نہیں" پر احمدؔ

اُس کو سوچا تو حسیں رنگ بہاریں پھوٹیں
فصلِ گل اُگنے لگی دل کی زمیں پر احمدؔ

دل تو اوہام پرستی میں لگا رہتا ہے
کیا کرے کوئی یقیں ایسے یقیں پر احمدؔ

اپنے احوال کو کیوں اتنا چھپا رکھا ہے
کوئی تحریر نہیں تیری جبیں پر احمدؔ

ظلم اِک روز سرِ دار لٹک جائے گا
آہ پہنچے گی کبھی عرش بریں پر احمدؔ

صرف امّید نہیں بلکہ یقیں ہے مجھ کو
کوئی چشمہ ابھی پھوٹے گا یہیں پر احمدؔ

❖❖❖

◎

جیسے دریاؤں میں پانی کا گزر رہتا ہے
میرے اندر بھی کوئی محوِ سفر رہتا ہے

درِ نسیاں سے نکل آتی ہیں یادیں اب بھی
زخم بھرتے ہیں مگر ان کا اثر رہتا ہے

کسی دستک سے یہ دیوار بھی کُھل سکتی ہے
گرچہ لگتا نہیں ، امکان مگر رہتا ہے

خوف نے مجھ کو کبھی تنہا نہیں رہنے دیا
اب بھی بچپن کا یہ ساتھی مرے گھر رہتا ہے

حرف بُنتا ہے خیالات کو دیتا ہے نقوش
دل کے آنگن میں کوئی اہلِ ہنر رہتا ہے

اک خلش رات کو سونے نہیں دیتی مجھ کو
کوئی قرضہ ہے جو اب تک مرے سَر رہتا ہے

پاؤں اس واسطے رکھتا ہوں جما کر احمدؔ
جانے کیوں مجھ کو پھسل جانے کا ڈر رہتا ہے

❖❖❖

◎

وہ شروعاتِ محبت میں پریشان سا تھا
دل کے بدلے ہوئے حالات پہ حیران سا تھا

عمر ساری ہی مری اس کے تعاقب میں کٹی
وہ جو اک کام بظاہر مجھے آسان سا تھا

تجھ کو کھونے میں خسارہ ہی خسارہ تھا مگر
تجھ کو پانے میں بھی اندیشۂ نقصان سا تھا

ایک تو جبر نے رگ رگ کو دبا رکھا تھا
دوسرا تازہ ہواؤں کا بھی فقدان سا تھا

زندگی کیسے سہولت سے جیے جاتا مَیں
خوف تو تھا ہی مگر خوف بھی انجان سا تھا

بے وفائی تو کسی وقت بھی ہو سکتی تھی
گو یقیں مجھ کو نہیں تھا مگر امکان سا تھا

اُس نے اک روز بہر کیف چلے جانا تھا
وہ تو صورت سے ہی لگتا کوئی مہمان سا تھا

ایک دولت ہی مرے پاس نہیں تھی ورنہ
تجھ کو پانے کا تو نسخہ بہت آسان سا تھا

اس طرح ڈھوتے رہے اپنے بدن کو احمدؔ
جیسے یہ جسم کسی اور کا سامان سا تھا

❖❖❖

◎

تشنگی ہاتھ پکڑ لائی ہے تب آیا ہوں
اپنی مرضی سے ترے در پہ مَیں کب آیا ہوں

میری نسبت ہے چراغوں کے قبیلے سے میاں
مَیں ہمیشہ ہی سرِ ظلمتِ شب آیا ہوں

آنکھ بھر کر تو کبھی آپ کو دیکھا ہی نہیں
جب بھی آیا ہوں تہِ بارِ ادب آیا ہوں

مجھ گنہگار کو تُو اتنی حقارت سے نہ دیکھ
لے کے دنیا میں خلافت کا لقب آیا ہوں

عشق کے سارے تقاضوں کی خبر ہے مجھ کو
تیرے دربار پہ بے نام و نسب آیا ہوں

کس طرح لیتا کسی غیر کے ہاتھوں سے عطا
چشمۂ خضر سے بھی تشنہ طلب آیا ہوں

چار دیواری میں دم گھٹنے لگا تھا احمدؔ
مَیں یہاں دشت کی وسعت کے سبب آیا ہوں

❖❖❖

◎

دل جو بھر آیا تو پل بھر کے لیے رو لے گا بس
تھک گئی آنکھیں تو پھر کچھ دیر کو سو لے گا بس

حیرتی ہوں لب تو ہلتے ہیں صدا آتی نہیں
ایسے سنّاٹے میں لگتا ہے خدا بولے گا بس

بندھ گیا ہے سلسلہ اشکوں کا میری آنکھ سے
اب ترا دستِ حنائی یہ گرہ کھولے گا بس

غیر کی کوئی جگہ ہے کیا ترے دستور میں
اب یہاں وہ ہی جیئے گا جو ترا ہولے گا بس

عقل و دانش سے تو اس کا واسطہ کوئی نہیں
جب بھی بولے گا وہ ظالم کفر ہی تولے گا بس

❖ ❖ ❖

کسی مقام پہ اپنا قیام ہو نہ سکا
ہماری خواہشوں کا اختتام ہو نہ سکا

اب ایسی زندگی کو کس طرح سراہیں ہم
کسی کے کام جو آتا وہ کام ہو نہ سکا

ہمارا تجربہ کہتا ہے ہجرتوں کے بغیر
کوئی جہان میں عالی مقام ہو نہ سکا

ہر ایک سانس لگا دی اسی تردّد میں
مرادِ دل کا مگر اہتمام ہو نہ سکا

ہجومِ شہر نے روکا ہوا تھا رستہ مرا
ہجومِ شہر کبھی مجھ سے رام ہو نہ سکا

ہماری ذات کی دیوار منہدم نہ ہوئی
ہمیں جو کہنا تھا تجھ سے کلام ہو نہ سکا

تمام عمر گزاری اسے سِدھاتے ہوئے
مگر یہ دل کبھی میرا غلام ہو نہ سکا

❖❖❖

◎

لگا تھا خوف دکھانے وہ میرے اندر کا
اٹھا کے پھینک دیا مَیں نے آئنہ گھر کا

رگوں میں ایسے بسا ہے کہ باہر آتا نہیں
علاج کیا کِیا جائے چھپے ہوئے ڈر کا

جب اس کی آنکھ کا خاکہ اتارنے لگا میں
حوالہ آنے لگا جا بجا سمندر کا

مجھے گرانے سے پہلے تجھے یہ سوچنا ہے
کہ کیا علاقہ ہے دیوار سے ترے گھر کا

مَیں زندگی کے سمندر میں تیرتا کیسے
بنا دیا تھا کسی نے مجھے جو پتھر کا

بس ایک جست ہی کافی ہے سرفرازی کو
ہے کتنا فاصلہ دستار سے مرے سر کا

حصولِ رزق میں عجلت ہے کا ہے کی احمدؔ
ملے گا موت سے پہلے تجھے مقدّر کا

❖❖❖

◎

وہی شجر جو مجھے اس جہاں پہ لے آیا
اسے اٹھا کے مَیں پھر آسماں پہ لے آیا

نیا نکور تھا بالکل، ادھڑ گیا ہوں مَیں
زمانہ مجھ کو کہاں سے کہاں پہ لے آیا

اب اس قدر بھی پرانا نہیں ہُوا تھا مَیں
اٹھا کے مجھ کو کباڑی دکاں پہ لے آیا

مَیں جانتا ہی نہ تھا اپنی منزلِ مقصود
مجھے یہ راستہ تیرے مکاں پہ لے آیا

جو وہم مجھ کو ہُوا تھا خدا کے بارے میں
گھما پھرا کے اسے مَیں گماں پہ لے آیا

❖❖❖

◎

آگ روشن ہو تو کیوں اس کو ہَوا دی جائے
اس کا مطلب یہ ہُوا آگ بجھا دی جائے

اس سے پہلے کہ خدوخال ہَوا ہو جائیں
وقت کی ریت پہ تصویر بنا دی جائے

جسم اور روح میں روزانہ جدل ہوتا ہے
کیوں نہ ان میں کوئی دیوار اٹھا دی جائے

آج کے دور میں جو دردِ جنوں رکھتے ہیں
ایسے لوگوں کو تہِ دل سے دعا دی جائے

جس پہ لکھی ہوئی تحریر نہیں پڑھتا کوئی
جی میں آتا ہے وہ دیوار گرا دی جائے

نت نئی خواہشوں کے قتل سے بہتر ہے یہی
ایک ہی بار انہیں آگ لگا دی جائے

آج پھر مرگِ محبت پہ چراغاں ہو گا
طاقِ ابرو پہ کوئی شمع جلا دی جائے

❖❖❖

◎

خاک اور خون میں لتھڑا ہوا بہتا دریا
مَیں نے جھیلا ہے رہِ عشق میں ایسا دریا

میری گہرائی کا اندازہ تجھے کیسے ہو
مَیں وہ قلزم ہوں کہ جس میں ہوئے یکجا دریا

ہجر کی لہر سے جب میرا کنارہ ٹوٹا
میری دہلیز پہ آ کر بڑا رویا دریا

دشت کی ریت نے لمحوں میں اسے چاٹ لیا
راستہ بھول کے صحرا میں جو اترا دریا

مست موجوں نے لیں اُٹھ اُٹھ کے بلائیں توبہ
دیکھ کر گیلا بدن جوش میں آیا دریا

ایک دن چیختی چنگاڑتی موجوں کے سبب
آ گیا تھا مرے گھر خوف کا مارا دریا

اپنے اندر کسی دریا کی طرح بہتا ہوں
دیکھ کر مجھ کو یونہی تو نہیں بپھرا دریا

❖❖❖

◎

سکّہ دل کو ترے ہاتھ پہ دھر جاتے ہیں
عشق سا کام بھی خیرات میں کر جاتے ہیں

اک طرف آگ تھی اور ایک طرف پانی تھا
ہم نے سوچا کہ یہیں بیٹھ کے مر جاتے ہیں

بس ٹھکانہ ہی بدلتے ہیں پری وش چہرے
دل سے جاتے ہیں تو آنکھوں میں ٹھہر جاتے ہیں

اپنی ہستی کو بھلاتا ہوں تو یوں لگتا ہے
سارے رستے ہی مرے یار کے گھر جاتے ہیں

سارے منظر ہمیں دھندلائے ہوئے لگتے ہیں
ہم جدھر جاتے ہیں بادیدۂ تر جاتے ہیں

اسلحہ اتنا ضروری نہیں آدم کے لیے
لوگ تو عزت و غیرت سے بھی مر جاتے ہیں

کارِ مشکل ہے اسے دل سے بھلانا احمدؔ
ہم نے سوچا یہ کٹھن کام بھی کر جاتے ہیں

❖❖❖

◎

راستہ کوئی درمیانی ہو
جو زمینی نہ آسمانی ہو

زندگی بس سمجھ میں آ جائے
ایک آسان سی کہانی ہو

کیا عجب ہے جو میرے اندر ہے
سلسلہ اس کا لامکانی ہو

ہیئتِ موت ہی بدل جائے
زندگانی ہی زندگانی ہو

میری مٹی نہ مجھ کو لے ڈوبے
مجھ پہ اتنی سی مہربانی ہو

موت سارے دکھوں کا ہے تریاق
کاش اس کا بھی کوئی ثانی ہو

مغفرت پیاس بن کے آجائے
گر خطا کار پانی پانی ہو

زندگی کا مزا تو تب ہے میاں
حسن ہو عشق ہو جوانی ہو

دوست اچھے نہیں تو خیر احمدؔ
دشمن اپنا تو خاندانی ہو

❖❖❖

◎

کسی کی خاک اڑائی کسی کو رام کیا
یہی تماشا لگاتار صبح و شام کیا

رگِ حیات کے سب سلسلوں کو کاٹ دیا
غمِ حیات کا قصّہ بھی یوں تمام کیا

خدا معاف کرے ہم سیاہ کاروں کو
کہ جو بھی کام کیا بس برائے نام کیا

یہ دل ٹکے ہے کہیں پر نہ پاؤں رکتے ہیں
حصولِ رزق نے جینا مرا حرام کیا

اسی میانہ روی نے کیا مجھے مامون
کہ خود کو حُر کیا مَیں نے نہ ہی غلام کیا

تمام سلطنتِ دل تجھے ہبہ کر دی
نواحِ دل کا علاقہ بھی تیرے نام کیا

دیارِ دل کا فسانہ بھی کیا کہیں احمدؔ
اسی نے لوٹ لیا جس نے بھی قیام کیا

❖❖❖

◎

ہر کام کیا مَیں نے سلیقے سے ادب سے
بس عشق ہی کرنا نہیں آیا مجھے ڈھب سے

تُو خوب ہے یا تیرا تکلّم ہے بہت خوب
ہوتی رہی تکرار یہی خلوتِ شب سے

یہ شہر بھی اب چھوڑ کے جانا ہی پڑے گا
کچھ روز سے تم بھی مجھے لگتے ہو عجب سے

کچھ بولیے حالات کی قدغن سے نکل کر
بھولے سے جو آئے ہو مرے گھر میں سبب سے

تم یوں ہی نہیں آئے مرے دستِ دعا میں
مانگا تھا کبھی مَیں نے تمہیں حسنِ طلب سے

اِک نام ہے ہابیل اور اِک نام ہے قابیل
بس دو ہی قبیلے ہوئے آدم کے نسب سے

جب سے ترے دیدار کی سولی پہ چڑھا ہوں
اک آگ سلگتی ہے مرے پہلو میں تب سے

❖❖❖

◎

رسومِ عہد کے سب دائروں کو توڑ کے مَیں
نکل پڑا ہوں زمانے کو پیچھے چھوڑ کے مَیں

پھر ایک دم کسی نے بادبان کھول دیئے
پہنچ رہا تھا ارادوں کو جوڑ جوڑ کے مَیں

نجانے کونسے سے طوطے میں جان ہے اس کی
سو دیکھ لیتا ہوں کچھ گردنیں مروڑ کے مَیں

بھرا نہیں ہے ابھی تک شکم ستمگر کا
پلا چکا ہوں رگوں کا لہو نچوڑ کے مَیں

ترے خیال کی آرائشوں کی خاطر ہی
بچا کے لایا ہوں کچھ سانس جوڑ جوڑ کے مَیں

کسی طرح بھی تلافی نہ ہو سکی احمدؔ
اگرچہ لایا تھا کچھ اشک بھی نچوڑ کے مَیں

❖❖❖

◎

رہینِ عہد رہا واگزار ہونے تک
لگا ہے وقت مجھے ذی وقار ہونے تک

مقامِ زار پہ پہنچے تو اڑنے لگتی ہے
بدلتی رہتی ہے مٹی غبار ہونے تک

بہت جتن کیے ہیں التفات کی خاطر
مَیں زخم زخم ہُوا اعتبار ہونے تک

کئی برس لگے تھے انتظار کرتے ہوئے
مَیں بے شمار ہُوا تھا شمار ہونے تک

وہ ایک دن کا تماشا تو تھا نہیں احمدؔ
مَیں اشک اشک ہُوا دل فگار ہوتے تک

❖❖❖

◎

تڑپ رہا تھا جنوں قہقہے لگاتے ہوئے
سسک پڑا تھا کوئی تالیاں بجاتے ہوئے

کبھی جوانی کبھی بچپنے میں جاتے ہوئے
مَیں خود سے محوِ تکلّم تھا مسکراتے ہوئے

ہر ایک شخص مرے سامنے ہُوا دیوار
کٹی ہے عمر مری راستہ بناتے ہوئے

اڑا رہا تھا خیالات کے پرندوں کو
اتر رہے تھے کچھ اشعار گنگناتے ہوئے

مَیں پھنس گیا تھا کسی اژدھے کے کنڈل میں
زمیں پہ پھیلے ہوئے دائرے اٹھاتے ہوئے

عجب تضاد کی زد میں تھیں انگلیاں اُس کی
جگا رہی تھیں مسلسل مجھے سلاتے ہوئے

جگہ جگہ پہ پڑی تھیں نشانیاں احمدؔ
مَیں زخم زخم ہُوا تھا انہیں اٹھاتے ہوئے

❖❖❖

دمِ آخر تھا کوئی بول رہا تھا مجھ میں
ایک دروازہ نیا کھول رہا تھا مجھ میں

درد اتنا کہ لگا سانس اکھڑ جائے گی
موت کا زہر کوئی گھول رہا تھا مجھ میں

ایک بت تھا مرے سینے میں دھڑکتا ہُوا بت
خوف کا مارا ہُوا ڈول رہا تھا مجھ میں

اک پرندہ بڑی عجلت میں نظر آتا تھا
اڑنے کے واسطے پر تول رہا تھا مجھ میں

وہ کہانی بھی عجب عشق کہانی تھی میاں
مَیں تو خاموش تھا دل بول رہا تھا مجھ میں

ایک میزان ہمہ وقت تھا مصروفِ عمل
سارے اعمال مرے تول رہا تھا مجھ میں

◎

وہ جس کے عقیدے میں محبت ہی نہیں ہے
اس شخص کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

پہنچا ہوں کئی بار وہاں اپنی طلب میں
جس جا پہ ستارے ہیں فلک ہے نہ زمیں ہے

اِس عشق کی اب دیکھئے کب اُس کو خبر ہو
یہ بات ابھی تک تو مرے اپنے تئیں ہیں

ہر لمحہ مری سانس نے محسوس کیا ہے
دھڑکن کی طرح کوئی مرے دل کے قریں ہے

تم ایڑیاں رگڑو بھلے ماتھے کو گھساؤ
اس جا پہ کوئی چشمہ ابلنے کا نہیں ہے

یہ آنکھ جسے ڈھونڈتی پھرتی ہے جہاں میں
وہ صورتِ تمثال سرِ خاک کہیں ہے؟

❖❖❖

◎

رشتہ داری نہ تعلّق نہ کوئی ناتا ہے
پھر بھی وہ شخص مجھے اپنا نظر آتا ہے

مسکرائے تو مری جان پہ بن جاتی ہے
بات کرتا ہے تو رگ رگ میں سما جاتا ہے

وہ مجھے اپنا سمجھتا ہے نہ غیروں کی طرح
ہم میں برسوں سے یہی رشتہ چلا آتا ہے

سادگی اُس کی مرے پیشِ نظر رہتی ہے
مَیں اسے جتنا بناتا ہوں وہ بن جاتا ہے

میری سانسیں ابھی ہموار نہیں ہو پاتیں
دل نئی خواہشیں کاندھے پہ اٹھا لاتا ہے

میری دوری بھی گوارا نہیں ہوتی اس کو
مَیں اسے پاس بلاؤں تو وہ گھبراتا ہے

اپنی تنہائی میں کرتا ہے وہ مجھ سے باتیں
اور جب سامنے آتا ہے تو شرماتا ہے

مَیں کہیں جھانک نہ لوں اُس کے نہاں خانے میں
اس لیے وہ مجھے ملنے سے بھی کتراتا ہے

❖❖❖

◎

سنا کے دل کا اسے اپنا حال ، دیکھتا ہوں
مرے لیے ہے یہ کارِ محال ، دیکھتا ہوں

مَیں جب بھی حسن کو تصویر کرنے لگتا ہوں
بنظرِ شوق ترے خدّوخال دیکھتا ہوں

مجالِ حشر کی جانب رواں دواں ہیں لوگ
ہر ایک سر پہ میں اس کا وبال دیکھتا ہوں

زمیں کو دیکھتا ہوں قافیے ردیف کے ساتھ
پھر اس پہ کھینچ کے اپنا خیال دیکھتا ہوں

غزل کو لکھ کے اسے بار بار پڑھتا ہوں
ملول ہو کے مَیں اپنا ملال دیکھتا ہوں

جو دھول بن کے مسافت میں دب گئے احمدؔ
مَیں مثلِ آئنہ وہ ماہ و سال دیکھتا ہوں

❖❖❖

◎

ایک سا منظر ہے کب سے مختلف ہوتا نہیں
راز بستہ ہے کوئی جو منکشف ہوتا نہیں

ختم ہوتا ہی نہیں ہے بے یقینی کا سفر
دل کسی بھی دائرے میں معتکف ہوتا نہیں

بیسیوں تحسین کرتے ہیں سخن پرور مری
معترف ہونا تھا جس کو معترف ہوتا نہیں

سوچتا تھا ایک حصّے کو ہبہ کر دوں تجھے
دل کا کیا کیجئے ستمگر منتصف ہوتا نہیں

ایک دو راہے پہ مَیں نے زندگی کر دی تمام
وہ کیے وعدوں سے ظالم منحرف ہوتا نہیں

یہ کسی درویش کا دل تو نہیں بندہ نواز
جو صفاتِ دنیوی سے مُتّصف ہوتا نہیں

دل کو یکسوئی کی جانب کھینچتا ہوں بار بار
''شین'' کا یہ حرف مجھ سے کیوں ''الف'' ہوتا نہیں

❖❖❖

◎

یہی ہے خواہشِ دل میری اختصار کے ساتھ
شمار ہونے لگے میرا بے شمار کے ساتھ

امیدِ وصل نے اس کو بحال رکھا تھا
یہ سانس چلتی رہی تیرے انتظار کے ساتھ

گزر گئی شبِ مہجور گفتگو کرتے
گلے بھی کرتا رہا مَیں فراقِ یار کے ساتھ

یہاں تو عشق بھی سونے کے بھاؤ بکتا ہے
جڑی ہوئی ہے محبت بھی کاروبار کے ساتھ

خدا کے فضل سے خوش باش زندگی ہے مری
ترے بغیر بھی زندہ ہوں اعتبار کے ساتھ

رہِ حیات پہ چلتے ہوئے لگا احمدؔ
کہ ایک جبر بھی شامل ہے اختیار کے ساتھ

❖❖❖

◎

جب بھی رستے کی تھکن پاؤں کی زنجیر بنی
میرے خوابوں کے لیے باعثِ تعزیر بنی

مَیں تری ذات کی تعلیل کو آیا ہوں یہاں
میری ہیئت ترے اجمال کی تفسیر بنی

کوئی بھی حرف اجاگر نہیں کر پایا اسے
میرے تہ دار خیالوں میں جو تصویر بنی

اس لیے بھی کسی قاصد کی ضرورت نہ رہی
اس کے شایان کوئی مجھ سے نہ تحریر بنی

کوئی تبدلی مرے بس میں نہیں تھی احمدؔ
میری مجبوری بالآخر مری تقدیر بنی

❖❖❖

◎

مجھے جھنجھوڑا گیا اور پھر مروڑا گیا
رگِ حیات سے سارا لہو نچوڑا گیا

مرے حواس نے جب میرا ساتھ چھوڑ دیا
تہِ زمیں کہیں لے جا کے مجھ کو چھوڑا گیا

مجھے دکھایا گیا پھر سے زندگی کا خواب
مرے خیال کو ماضی کی سمت موڑا گیا

صدا بلند ہوئی احتساب ہونے لگا
مرے وجود سے پھر میرا ناتا جوڑا گیا

خدا کا نام لیا اور رسول ﷺ کے صدقے
مجھے نجات ملی اور مجھ کو چھوڑا گیا

❖❖❖

◎

اٹھا تلوار سر پر وار کر دے
مَیں ناہموار ہوں ہموار کر دے

مجھے طلبِ جہاں داری نہیں ہے
فقیری کو مری دستار کر دے

ترے رستے کی اک دیوار ہوں مَیں
مجھے ٹھوکر لگا مسمار کر دے

دِیے کا خوف کیوں جاتا نہیں ہے
جہاں در ہے وہاں دیوار کر دے

محبت کوئی صدقہ تو نہیں ہے
کسی کے سر سے کوئی وار کر، دے

کوئی تو نرم گوشہ ہے ادھر بھی
وگرنہ وہ ابھی انکار کر دے

تُو اپنا شوق پورا کر لے احمدؔ
مرا جینا بھی اب دشوار کر دے

❖❖❖

◎

مرے حواس پہ وہم و گماں کا غلبہ ہے
کہ جیسے دریا پہ آبِ رواں کا غلبہ ہے

مَیں اختیار کے جھانسے میں آ گیا بیکار
یہاں زمیں کا وہاں آسماں کا غلبہ ہے

کبھی میں اسپ جہاں پر سوار ہوتا ہوں
کبھی لگے ہے کہ کارِ جہاں کا غلبہ ہے

کہاں کہاں سے گزر کر یہاں نہیں پہنچا
مری کہانی پہ اک داستاں کا غلبہ ہے

مَیں اپنے رخ کو بھی تبدیل کر نہیں پاتا
چہار سمت مرے کارواں کا غلبہ ہے

خدا کرے کہ مَیں اس دھوپ سے نکل آؤں
ادھر چلوں جہاں ابرِ رواں کا غلبہ ہے

ابھی تلک تو سفر میں ہوں خیمہ زن احمدؔ
مرے وجود پہ کچّے مکاں کا غلبہ ہے

❖❖❖

◎

بھوک مٹتی ہے نہ رہنے کو مکاں ملتا ہے
بے نواؤں کو تو ایسا ہی جہاں ملتا ہے

اے مرے دوست مرا چہرہ ذرا غور سے دیکھ
عمرِ رفتہ کا تجھے کوئی نشاں ملتا ہے؟

کوئی تصویر ٹھہرتی ہی نہیں آنکھوں میں
بہتے پانی میں فقط عکسِ رواں ملتا ہے

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں ترا نام نہیں
بس یہی بات وہ کہتا ہے جہاں ملتا ہے

نوکِ خنجر سے بنائی ہے ہتھیلی پہ لکیر
ورنہ عشق اتنی سہولت سے کہاں ملتا ہے

زندہ لوگوں کی یہ بستی نہیں لگتی احمدؔ
یاں تو ہر شخص کا آپس میں بیاں ملتا ہے

❖❖❖

◎

سنبھلتا کیسے سنبھالا نہیں گیا
گئی رتوں کا حوالہ نہیں گیا

فلک کی آنکھ میں لالی ہے کس لیے
ابھی لہو تو اچھالا نہیں گیا

نظر پڑے ہیں جو فاقہ زدہ بدن
گلے سے نیچے نوالہ نہیں گیا

وہ کانٹا لاکھ توجہ کے باوجود
کبھی بھی دل سے نکالا نہیں گیا

غریب مجھ سا جہاں میں کوئی نہ ہو
اکیلا زخم بھی پالا نہیں گیا

دمک رہا ہے وہ میرے وجود میں
بجھا چراغ اجالا نہیں گیا

❖❖❖

◎

لاشے پڑے تھے غار دہانے کے آس پاس
اِک معرکہ ہوا تھا خزانے کے آس پاس

لوگوں نے تیرے نام سے منسوب کر دیا
اک زخم کیا لگا مرے شانے کے آس پاس

گھیرا ہوا ہے ایسے نئی نسل نے مجھے
جیسے نیا ہو شہر پرانے کے آس پاس

میری طرف کسی نے اُٹھائی نہ تھی نظر
مَیں بھی پڑا ہوا تھا خزانے کے آس پاس

چینی کے برتنوں کی طرح ٹوٹے رات بھر
بکھرے پڑے تھے خواب سرہانے کے آس پاس

خانہ بدوش تھا وہ کسی کا نہ ہو سکا
پہنچا نہ کوئی اُس کے ٹھکانے کے آس پاس

❖❖❖

◎

غموں کی بھیڑ میں اک راستہ بناتے ہوئے
مَیں لڑکھڑایا بہت آسرا بناتے ہوئے

الجھ پڑے تھے کئی زاویے لکیروں سے
پھسل گیا تھا قلم دائرہ بناتے ہوئے

ہر ایک شخص کو چہرہ دکھاتا پھرتا ہے
ہنسا تو ہو گا خدا آئنہ بناتے ہوئے

ہجومِ شہر نے تسخیر کر لیا ہے اسے
جو خوش گماں تھا بہت قافلہ بناتے ہوئے

بہت پرانی شناسائی تھی مگر تُو نے
ذرا بھی سوچا نہیں مسئلہ بناتے ہوئے

گماں نہیں تھا مجھے اس کی زد میں آنے کا
مَیں خود کو بھول گیا ضابطہ بناتے ہوئے

❖❖❖

◎

درد کا انتقال ہونے دے
راستے کو بحال ہونے دے

دھیرے دھیرے بدن بھی ناچے گا
دل کے اندر دھمال ہونے دے

اپنی وحشت سے دور رکھ اس کو
زخم کا اندمال ہونے دے

تیرگی روشنی کا ہالہ ہے
باہمی اتّصال ہونے دے

عشق خود راستہ بناتا ہے
کیا کسی کی مجال ، ہونے دے

بڑا مشکل ہے دل سخن کرنا
روح کو پُرملال ہونے دے

''مَیں'' کی دیوار کو گرا احمدؔ
یہ بھی کارِ محال ہونے دے

❖❖❖

◎

روٹھا ہوا پڑا ہوں خرد کے لباس میں
ہونے لگے ہیں فیصلے ہوش و حواس میں

وجدان کہہ رہا ہے کوئی آس پاس ہے
آتا نہیں ہے جو کبھی حدِّ قیاس میں

کہتا ہے مجھ سے آئنہ اس کو اُتار دے
اب تازگی نہیں رہی خاکی لباس میں

اے شہریار ان کی دَریدہ دلی نہ پوچھ
عُریاں بدن پڑے ہیں جو پیلی کپاس میں

تو نے بڑھا ہی دیں مرے لہجے کی تلخیاں
تیری کھٹاس مل گئی میری مٹھاس میں

دل میں خلوص و پیار کی اتنی کمی ہوئی
کوئی اثر نہیں رہا حرفِ سپاس میں

❖❖❖

◎

تمہاری آنکھ کے پیچھے نہاں کوئی تو ہو گا
وہ جس کا سوچتے ہو تم جہاں کوئی تو ہو گا

چلو مانا کہ فطرت ہی ہے قانونِ خلائق
مگر ان فطرتوں کا رازداں کوئی تو ہو گا

پکڑ کر ہاتھ جو شوریدہ مٹی سے نکالے
جہاں میں اس طرح کا مہرباں کوئی تو ہو گا

عدم کی راہ پر نکلے مسافر سوچتے ہیں
ابد کے راستے کا کارواں کوئی تو ہو گا

محبت لازماً کوئی علامت چھوڑتی ہے
تمہاری روح پر ایسا نشاں کوئی تو ہو گا

مَیں اس امّید پر اشعار کہتا جا رہا ہوں
مرے جذبوں کا آخر ترجماں کوئی تو ہو گا

صدا جو گونجتی ہے گنبدِ خاکی کے اندر
دلِ بے تاب میں محوِ اذاں کوئی تو ہو گا

❖❖❖

◎

ہَوائے زیست کے زیرِ اثر سمجھتا نہیں
مسافرت کی حدوں کو بشر سمجھتا نہیں

گماں شکار ہوا ہے نگار خانۂ دل
فریب کار کا سوئے ہنر سمجھتا نہیں

ثمر نہیں ہے تو چھاؤں بہت ضروری ہے
یہ بات شاخ بریدہ شجر سمجھتا نہیں

فلک پہ اور خطا کار ہے تو ربِّ عظیم
اسے اتار زمیں پر اگر سمجھتا نہیں

مَیں جانتا ہوں متاعِ غرور ہے دنیا
طلسم ساز کو یہ دل مگر سمجھتا نہیں

عدم وجود کی کنڈلی میں آدمی ہے مقیم
نہیں ہے اور کوئی جائے مفر سمجھتا نہیں

❖❖❖

◎

خود سے قائم تو نہیں ہے یہ نظامِ فطرت
کھینچ رکھی ہے کسی نے تو لگامِ فطرت

کوئی تو ہے پسِ اجسام جو کُن بولتا ہے
جس نے دنیا کو بنایا ہے غلامِ فطرت

فقط اس واسطے در در پہ محبت بانٹی
مَیں محبت کو سمجھتا ہوں پیامِ فطرت

ظلم کو ظلم کہا عدل کا پرچار کیا
مَیں نے لکھا ہے ہر اِک حرف بنامِ فطرت

موسمِ سبز ہمیشہ نہیں رہتا احمدؔ
روز پیڑوں سے مَیں سنتا ہوں کلامِ فطرت

❖❖❖

◎

ہَوائے حرص و ہوس ساتھ جاری ہے
بنامِ عزّوشرف انحطاط جاری ہے

وہ دن ہَوا ہوئے کہ لوگ ایسے کہتے تھے
گناہگار ہیں ہم احتیاط جاری ہے

کمال طرزِ تکلّم ہے اس پری وش کا
لبوں پہ مہرِ خموشی ہے بات جاری ہے

لباسِ تیرہ شبی کو اجال دے مولا
مرے افق پہ تو برسوں سے رات جاری ہے

اگرچہ ترکِ تعلّق بھی کر لیا اس نے
دلِ حزیں پہ مگر التفات جاری ہے

چراغِ شوق ابھی مت بجھائیے احمدؔ
ابھی تو سلسلۂ کائنات جاری ہے

❖❖❖

◎

نارسائی کا جو غم تھا وہ سوا ہونے لگا
میرے اندر ایک ماتم سا بپا ہونے لگا

تیری آنکھوں نے نمو بخشی دلِ ناشاد کو
دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے ہرا ہونے لگا

آنکھ کی دہلیز سے خوابوں کی میّت اٹھ گئی
جب مرا خاکی بدن مجھ سے جدا ہونے لگا

ڈھیل دینے کا نتیجہ دیکھئے بندہ نواز
وہ جو مارِ آستیں تھا اژدہا ہونے لگا

کُھل ہی جاتے ہیں مناظر اپنے اپنے وقت پر
جس طرح وہ شخص مجھ پر آئنہ ہونے لگا

بات بھی کرنے لگے گا دھیرے دھیرے مجھ سے وہ
اب مرا احمدؔ سے کھل کر سامنا ہونے لگا

❖❖❖

◎

میری تنہائی کو مٹا دیجے
میرے جیسا کوئی بنا دیجے

دھیرے دھیرے سلگ رہا ہوں مَیں
بجھ نہ جاؤں کہیں، ہوا دیجے

یا مری سمت بھی ہو نظرِ کرم
یا مجھے بزم سے اٹھا دیجے

کب سے تصویر بن کے بیٹھا ہوں
مجھ کو دیوار سے لگا دیجے

پیش ہونا ہے آج اپنے حضور
تہ دل سے مجھے دعا دیجے

مجھ سے بے خانماں کا درماں ہو
اپنے پہلو میں کچھ جگہ دیجے

پھر سے آغازِ عشق کرتے ہیں
سابقہ تلخیاں بھلا دیجے

❖❖❖

◎

ہم سے نازک سے نگینے نہ سنبھالے جائیں
آپ بس اپنی محبت کو اٹھا لے جائیں

تیرہ و تار شبِ ہجر، فروزاں کرنے
ٹمٹماتا ہُوا یادوں کا دِیا لے جائیں

یہ خدا داد وطن ہے کوئی پرسان نہیں
جتنا بھی ہاتھ میں آتا ہے اٹھا لے جائیں

رو پڑا غربت و افلاس کا بخیہ بخیہ
اب فقط تاج نہیں سر بھی اچھالے جائیں

کیا یہ کم ہے کہ پُر آشوب جہاں میں ہم لوگ
اپنی ناموسِ محبت کو بچالے جائیں

ہم فقیروں سے بھلا اور توقع ہی کیا
آپ چاہیں تو میاں ہم سے دعا لے جائیں

بس اسی فکر میں اک عمر گنوا دی احمدؔ
پھول چہرے دلِ مضطر سے نکالے جائیں

❖❖❖

◎

سارے حیلے سارے جتن بیکار گئے
زیست کے طالب جان کی بازی ہار گئے

آنے والی رُت یہ مجھ سے پوچھے گی
پچھلی رُت میں تیرے کتنے یار گئے

اپنے دُکھ تو سہہ کر ہم خوش باش رہے
لیکن ہم کو بچوں کے دُکھ مار گئے

تُو بھی کس پتھر کے آگے جا رویا
تیرے سارے آنسو ہی بیکار گئے

وہ کیا جانیں، خواب تو پورا ہونا تھا
اپنی طرف سے یوسفؑ کو جو مار گئے

موت کی سرحد ایسی سرحد ہے احمدؔ
کبھی نہ لوٹے اب تک جو اُس پار گئے

❖❖❖

◎

ہم ترے بن ہی شب و روز گزارے جاتے
تجھ سے نظریں نہ ملاتے نہ ہی مارے جاتے

صرف اس واسطے ہی خود کو سنبھالے ہوئے تھے
ہم بکھر جاتے تو پھر ساتھ کنارے جاتے

بس اسی ڈر سے ترے ساتھ نہیں چلتے تھے
ہم جو جاتے تو خسارے بھی ہمارے جاتے

اسی لیے آئے دل و جاں کے اثاثے لے کر
ہم پہ جو قرض ہیں واجب، وہ اتارے جاتے

جس اذیّت سے اُٹھائے ہیں جنازے ہم نے
اس سے بہتر تھا کہ ہم لوگ بھی مارے جاتے

ایسی تصویر کبھی دیکھنا ہوتی نہ نصیب
اس وطن کے جو خدوخال سنوارے جاتے

ہم نے میدانِ محبت میں کیے ہیں کچھ کام
لوگ بے وجہ نہیں ہم کو پکارے جاتے

آزماتا تو سہی میری وفاداری کو
مَیں اُدھر جاتا جدھر تیرے اشارے جاتے

تجھ پہ احسان نہیں ہم نے کیا تھا احمدؔ
تیرے ہمراہ نہ ہوتے تو بھی مارے جاتے

❖❖❖

◎

زور دیتا ہوں ہمہ وقت شکایات پہ مَیں
دھیان دیتا ہی نہیں تیری عنایات پہ مَیں

مرثیہ لکھتا ہوں اور نوحہ گری کرتا ہوں
اپنے اسلاف کی تابندہ روایات پہ مَیں

بھیگ جاتا ہوں تری آنکھ غزل کرتے ہوئے
یاد رہتا ہوں کہاں ایسے مقامات پہ مَیں

تُو بضد ہے تو فقط تیری تسلّی کے لیے
دل بھی رکھ دوں گا کسی روز ترے ہاتھ پہ مَیں

آئنہ وار دکھائیں مری تصویر مجھے
تبصرہ کیا کروں الجھے ہوئے حالات پہ مَیں

میرا دشمن تو اسی بات پہ پژمردہ ہے
ہنستا رہتا ہوں لگاتار جو صدمات پہ مَیں

تُو نے بخشا ہے یہ اعزازِ خلافت مجھ کو
عرش پرتُو ہے اور اس ارضِ حکایات پہ مَیں

اک عجب صورتِ احوال سے دو چار ہوا
زیست کرتے ہوئے پہنچا جو مکافات پہ مَیں

اپنی آشفتہ سری سے مجھے ڈر لگتا ہے
ہاتھ رکھتا ہوں سلگتے ہوئے جذبات پہ مَیں

کرتے رہتے ہیں اضافہ مری توقیر میں لوگ
کان دھرتا ہی نہیں ایسی خرافات پہ مَیں

دل بھی اب مجھ سے خفا رہنے لگا ہے احمدؔ
عمر بھر چلتا رہا جس کی ہدایات پہ مَیں

کوئی روٹھا ہوا اِس سمت پڑا ہے احمدؔ
دستکیں دیتا ہوں دیوارِ ملاقات پہ مَیں

❖❖❖

◎

جب مکیں نہیں رہا تو پھر مکان کس لیے
عشق جاں گزیں نہیں تو قلب و جان کس لیے

ہم ترے وجود کی جو روشنی میں آ گئے
پھر مہ و نجوم کا یہ سائبان کس لیے

جب متاعِ دل نہیں تو پھر زیاں کا خوف کیا
مال و زر اگر نہیں تو پاسبان کس لیے

راستوں کی جستجو نہ منزلوں کی آرزو
کارواں کا تذکرہ ہے بر زبان کس لیے

کتنی بار کہہ دیا کہ ہم اسے بھلا چکے
ذکر اس کا گفتگو کے درمیان کس لیے

پیار ہے تو پھر حضور آزمائیے ہمیں
پیار ہی اگر نہیں تو امتحان کس لیے

خلوتوں کے ہم نشیں برائے نام رہ گئے
راز جب نہیں رہا تو راز دان کس لیے

آج تک کھلا نہیں ہے بھید بے وفائی کا
جانے مجھ سے ہو گیا وہ بدگمان کس لیے

❖❖❖

◎

وجودِ خاک سے جب تک جدا نہیں ہو گا
اسیرِ عشق کبھی بھی رِہا نہیں ہو گا

فقیہِ شہر نے نقشہ جو کھینچ رکھا ہے
مجھے یقیں ہے کہ ایسا خدا نہیں ہو گا

یوں انتظار میں شب بھر جلی بجھی آنکھیں
کوئی چراغ بھی ایسے جلا نہیں ہو گا

ترے کرم کے سوا اے خدائے کون و مکاں
کوئی فریضہ بھی مجھ سے ادا نہیں ہو گا

تقاضا ایسا کرو جو کہ ممکنات میں ہو
بچھڑ کے جینے کا وعدہ وفا نہیں ہو گا

❖❖❖

◎

گرنے لگتے ہیں جو بیکار نظر آتے ہیں
زرد پتّے بڑے خوددار نظر آتے ہیں

اچھے حالات میں تو بھیڑ لگی رہتی ہے
بھیڑ پڑ جائے تو دو چار نظر آتے ہیں

جب بھی آثارِ قدیمہ پہ نظر پڑتی ہے
مجھ کو اپنے در و دیوار نظر آتے ہیں

موسمِ حبس میں چپ چاپ قطاروں میں کھڑے
نوحہ کرتے ہوئے اشجار نظر آتے ہیں

ان کے چہروں کی حقیقت تجھے معلوم کہاں
تیری محفل میں جو غمخوار نظر آتے ہیں

مَیں نے اس خوف سے مڑ کر نہیں دیکھا احمدؔ
اپنے قدموں کے ہی آثار نظر آتے ہیں

❖ ❖ ❖

◎

نبض پر ہاتھ رکھا اور کہا، قصّہ تمام
خامشی چھا گئی پھر شور اٹھا، قصّہ تمام

شہر میں قحط پڑا بھوک نے چاٹا جو بدن
ہاتھ سے کاسہ گرا اور ہوا، قصّہ تمام

آخری حرف سرِ نوکِ قلم رونے لگا
جونہی کاغذ پہ لکھاری نے لکھا، قصّہ تمام

عشق تو کانچ کے برتن کی طرح ہوتا ہے
ہاتھ سے جیسے گرا ٹوٹ گیا، قصّہ تمام

مرنے والوں کو یوں دستارِ فضیلت بخشی
ماتمی جلسہ ہوا، نوحہ کیا، قصّہ تمام

درد چن چن کے رکھے سینے کی الماری میں
ضبط نے شیشۂ دل توڑ دیا، قصّہ تمام

ہم سے کیا پوچھتے ہو عشق کہانی احمدؔ
ہجر کا زخم ملا چاٹ لیا، قصّہ تمام

❖❖❖

◎

تو اگر پیار سے دیکھے تو ثمر لگ جائے
طائرِ عشق کو سرخاب کا پر لگ جائے

آنکھ اور دل میں عجب نسبتِ یکسانی ہے
دل بھی لگتا ہے وہیں آنکھ جدھر لگ جائے

چھاؤں جس کی مری امّی کی رِدا جیسی ہو
میرے آنگن میں کوئی ایسا شجر لگ جائے

جانے کس حال میں ہوں گے سبھی جانے والے
کاش اِک بار مجھے ان کی خبر لگ جائے

مجھ کو ان تیز ہواؤں میں جلانا ہے چراغ
چاہے اس کارِ جنوں میں مرا سر لگ جائے

کاش ایسا ہو بدل جائے یہ منظر احمدؔ
لمحہ بھر کو مری بستر پہ کمر لگ جائے

❖❖❖

◎

سارے کردار ہیں کہانی سے
یہی سیکھا ہے زندگانی سے

اتنی طغیانی دل میں آئی تھی
راستہ بھر گیا تھا پانی سے

اک تماشہ بنا کے چھوڑ گئی
اب گلہ کیا کریں جوانی سے

ایک اک کر کے اٹھتے جاتے ہیں
یار سارے جہانِ فانی سے

دیکھ کر اس کی آنکھیں لگتا ہے
آئنہ بن گیا ہے پانی سے

اس سے پہلے کہ عشق رسوا ہو
مَیں نکل آیا اس کہانی سے

خوف آنے لگا ہے مجھے احمدؔ
اپنے جذبات کی روانی سے

❖❖❖

◎

مَیں جیسا ہوں مجھے ویسا لکھا ہے
قلم نے جس طرح چاہا لکھا ہے

مَیں اب تبدیل ہونے کا نہیں ہوں
مجھے اس نے ترا سایہ لکھا ہے

فقط اک راہ پر کیسے مَیں چلتا
کسی نے لوح میں دریا لکھا ہے

مرے اشعار میں اک داستاں ہے
محبت کا سفر نامہ لکھا ہے

مجھے معلوم ہے اس خط کے اندر
مرے محبوب نے کیا کیا لکھا ہے

ہتھیلی چومتا ہے وہ مسلسل
ہتھیلی پر نجانے کیا لکھا ہے

تمہاری ملکیت کے سلسلے میں
بیاضِ دل پہ اک دعوٰی لکھا ہے

❖❖❖

◎

کس جا پہ مَیں مقیم ہوں کوئی خبر نہیں
چاروں طرف مرے کوئی دیوار و در نہیں

اب کس کے سامنے رکھیں دل کے معاملات
اس شہر میں تو ایسا کوئی معتبر نہیں

وہ بے نظیر سنگ دلی میں بھی خوب ہے
اس پر مری فغاں کا بھی کوئی اثر نہیں

محرومیوں کی آگ جلانا نہیں مجھے
دولت تو مجھ کو چاہیے پر اس قدر نہیں

مانا ترا رسوخ ہے دنیا جہان میں
لیکن قضا کے سامنے تُو معتبر نہیں

ہونا پڑے گا داورِ محشر کے روبرو
اے بندۂ خدا تجھے اتنا بھی ڈر نہیں

❖❖❖

◎

تیرے لیے مَیں جان کو جوکھوں میں ڈال کر
لایا ہوں چند موتی سمندر کھنگال کر

سیراب کر ہی لوں گا مَیں دل کی زمین کو
صحرائے چشم سے کوئی دریا نکال کر

کٹتی نہیں ہے زندگی اُمّید کے بغیر
خوابوں کے واسطے کوئی رستہ بحال کر

مَیں نے تمہارے زخم کو ناخن پہ لکھ لیا
رکھوں گا دل کے طاق پر اس کو سنبھال کر

عاشق مزاج ہونا کوئی جرم تو نہیں
کیوں دیکھتا ہے مجھ کو تُو آنکھیں نکال کر

مَیں نے یہاں پہ عمر گزاری ہے اے غنیم
تُو دیکھ تو ذرا مری پگڑی اُچھال کر

تیری صداقتوں کی قسم کھا رہے ہیں ہم
تُو بھی ہمارے جھوٹ کا کچھ تو خیال کر

❖❖❖

◎

رشتوں کی دیکھ بھال میں صد چاک ہو گئے
خواب اپنی زندگی کے سبھی خاک ہو گئے

ہم کو کہاں تھا واسطہ دنیا جہان سے
یاروں کو دیکھ دیکھ کے چالاک ہو گئے

بس پہلے پہلے عشق میں ہم کو ہوئی تھی مات
پھر اس ہنر میں ہم بڑے مشّاق ہو گئے

اک لقمۂ حیات پہ بہنے لگا لہو
انسان اپنے عہد کے سفّاک ہو گئے

اس شوخ سے نظر ملی تو یوں لگا مجھے
لمحوں میں ساری عمر کے میثاق ہو گئے

غم کو تمہارا صدقہ گماں کر کے خوش ہوئے
خوشیوں کے التفات سے نمناک ہو گئے

❖❖❖

◎

رکھتے تھے ہم بھی اس پہ نظر، سوچتے نہ تھے
اک روز یہ بنے گی خبر، سوچتے نہ تھے

وہ بھی عجیب وقت تھا ہم تشنگانِ عشق
مرتے تھے بار بار مگر، سوچتے نہ تھے

ان کو بقا کی فکر نے مجبور کر دیا
ورنہ تو اس طرح سے شجر، سوچتے نہ تھے

ہم نے تمہارے درد کو رکھا سنبھال کر
بن جائے گا یہ زخمِ جگر ، سوچتے نہ تھے

جاری ہے اس جہاں میں مکافات کا عمل
یہ جانتے تھے اہلِ نظر ، سوچتے نہ تھے

کس واسطے خدا نے مکلف کیا انہیں
یہ بات خود پسند بشر ، سوچتے نہ تھے

ہم نے بدلتے وقت کی آواز کب سنی
ہم فیصلوں پہ بارِ دگر ، سوچتے نہ تھے

❖❖❖

◎

کوئی آندھی ہو کہ طوفان کھڑا رہتا ہوں
مَیں کسی پیڑ کی مانند گڑا رہتا ہوں

پھول کھلتے ہیں تو آنگن میں چلا آتا ہوں
ورنہ خوشبو کی محبت میں پڑا رہتا ہوں

لوگ ایسے ہی کسی کو نہیں عزّت دیتے
پیار کرتا ہوں تو لوگوں میں بڑا رہتا ہوں

سر اُٹھانے کی تو فرصت ہی نہیں ہے جب سے
عشق کے ہاتھ لگا پاؤں پڑا رہتا ہوں

کبھی سوچا ہی نہیں سود و زیاں کا قصّہ
بات سچی ہو تو اس پر مَیں اڑا رہتا ہوں

انگلیاں بولتی ہیں ہاتھ کبھی ناچتے ہیں
مَیں تو چپ چاپ انگوٹھی میں جڑا رہتا ہوں

خاک اور خون کی ہولی کا اثر ہے احمدؔ
مَیں جو راہوں میں سراسیمہ پڑا رہتا ہوں

❖❖❖

◎

وہ جو عشق میری زباں پہ تھا وہ بیاں سے کیسے نکل گیا
جو خیال میرے گماں میں تھا وہ گماں سے کیسے نکل گیا

مری مختصر سی جو عمر تھی یہی سوچتے ہوئے کٹ گئی
وہ جو شخص میری اَماں میں تھا وہ اَماں سے کیسے نکل گیا

مرے اختیار کا دائرہ مری دسترس میں رہا نہیں
وہ جو تیر میری کماں میں تھا وہ کماں سے کیسے نکل گیا

ترا نام زیست کا راز تھا جو کبھی لبوں پہ نہ آ سکا
سرِ بزم مجھ کو خبر نہیں وہ زباں سے کیسے نکل گیا

مرے محسنو! میرے دوستو کبھی آ کے مجھ کو خبر کرو!
وہ جو میرے دل کا مکین تھا وہ مکاں سے کیسے نکل گیا

تُو بڑا ذہین و فطین ہے مجھے اس کا کوئی جواب دے
جو سراغ دل کے نشاں میں تھا وہ نشاں سے کیسے نکل گیا

❖❖❖

◎

دھواں لپکتا ہے اور آگ بجھتی جاتی ہے
ردائے زیست بدن سے سرکتی جاتی ہے

وہ کون ہے جو مجھے پھیلنے نہیں دیتا
یہ خاک چاروں طرف سے سمٹتی جاتی ہے

مَیں کیا کروں یہ محبت مجھے بھی ساتھ لیے
مری حدود سے باہر نکلتی جاتی ہے

مَیں جس قدر نظر انداز کر رہا ہوں اسے
اسی قدر یہ تمنّا مچلتی جاتی ہے

بس ایک ڈور کی گتھّی ہے زندگی میری
مَیں اس کو کھولتا ہوں یہ الجھتی جاتی ہے

کوئی بھی شکل مری مستقل نہیں احمدؔ
بدل رہا ہوں کہ دنیا بدلتی جاتی ہے

❖❖❖

◎

اس قدر ہی رابطہ رکھا ہوا ہے
درمیاں اک راستہ رکھا ہوا ہے

مہرباں سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں
میز پر اک مسئلہ رکھا ہوا ہے

بھرنے دیتا ہی نہیں یہ ہجر کا غم
سارے زخموں کو ہرا رکھا ہوا ہے

لوگ مل کر بھی یہاں ملتے نہیں ہیں
قربتوں میں فاصلہ رکھا ہوا ہے

قدغنیں اظہار پر ہی تو نہیں ہیں
سوچ پر بھی دائرہ رکھا ہوا ہے

یوں ہمارے سامنے سج دھج رہے ہو
ہم نہ ہوں اک آئنہ رکھا ہوا ہے

❖❖❖

◎

وہ ☆مجھ شناس کہاں تھا جو مجھ میں اترا تھا
فقط وہ وہم و گماں تھا جو مجھ میں اترا تھا

یہ خاک اتنی کہاں معتبر کہ ہو مسجود
وہ کوئی سرِّ نہاں تھا جو مجھ میں اترا تھا

مَیں جس جہاں میں اتارا گیا تھا پہلے پہل
بعینہٖ وہ جہاں تھا جو مجھ میں اترا تھا

چہار سمت صفیں تھیں ملائکہ کی وہاں
وہ ان کا روح رواں تھا جو مجھ میں اترا تھا

مَیں خود کو دیکھ رہا تھا نگاہِ غائب سے
وہ اور تھا مَیں کہاں تھا جو مجھ میں اترا تھا

☆ بشکلِ مَیں تو کوئی بعد میں مکین ہوا
وہ دل تو خالی مکاں تھا جو مجھ میں اترا تھا

❖❖❖

◎

گر ہو ملال کوئی تو ایسا ملال ہو
جس کے بغیر سانس کا چلنا محال ہو

مے پی کے تیرے عشق کی یوں جھومتا پھروں
جیسے کسی ملنگ کے اندر دھمال ہو

محفل میں چاروں سمت ہو دیوارِ آئنہ
اور اس کے عین وسط میں وہ خوش جمال ہو

رکھا ہو میز پر دِیا، قرطاس اور قلم
چشمِ تصوّرات میں تیرا خیال ہو

مَیں چاہتا ہوں ایسے مری زندگی کٹے
اک ہجرِ ناتمام سے میرا وصال ہو

میرے لیے تو اتنا ہی کافی ہے اے خدا
قسمت میں میری لقمۂ رزقِ حلال ہو

کچھ تم بھی ہار مان لو، کچھ مَیں بھی مان لوں
میرے تمہارے درمیاں رستہ بحال ہو

❖❖❖

◎

مَیں مضطرب تھا مری جان پر بنی ہوئی تھی
مرے خیال میں اک روشنی بسی ہوئی تھی

نجانے کیسے منا کر اسے مَیں آیا ہوں
وہ برہمی جو مری راہ میں کھڑی ہوئی تھی

مَیں کس طرح سے جلاتا وہاں چراغ اپنا
نظر نظر تو اسی ایک پر جمی ہوئی تھی

وہ کیا زمانہ تھا کہ بات بات میں ترا ذکر
ترے شباب کی اک دھوم سی مچی ہوئی تھی

ہر ایک چہرہ مجھے ایک سا دکھائی دیا
ہر ایک شکل مفادات سے ڈھکی ہوئی تھی

مَیں چاہتے ہوئے بھی اس کو چھو نہیں پایا
مری ہی ذات مرے سامنے کھڑی ہوئی تھی

مرا وہاں پہ کوئی کام ہی نہ تھا احمدؔ
ہر ایک سمت منافع کی بُو رچی ہوئی تھی

❖❖❖

◎

ایسا نکتہ بھی کوئی دل کے دروں آ جائے
عقدۂ ذات کھلے مجھ کو سکوں آ جائے

عشق کرنے سے کہاں آپ کو روکے ہے کوئی
عشق تب کیجئے جب کارِ جنوں آ جائے

شعر کہنے کی اذیّت سے مَیں بچ سکتا ہوں
گر مجھے زمزمۂ کُن فیکوں آ جائے

دل تجھے چاہنے والا ہے انا گیر بہت
بِن بلائے تری محفل میں یہ کیوں آ جائے

اتنا بھی اُس سے تعلق نہیں بگڑا ہے مرا
مَیں اسے اب بھی بلاؤں تو وہ یوں آ جائے

دل ہمہ وقت بلاتا ہے اسے پر احمدؔ
میرا لگتا ہی وہ کیا ہے جو کہوں آ جائے

❖ ❖ ❖

◎

صدائیں سوزِ جگر سے لگائیے صاحب
درِ شباب کی الجھن بڑھائیے صاحب

کسی طرح ہمیں حیرت میں مبتلا کیجے
کسی طرح ہمیں پتھر بنائیے صاحب

یہ بابِ عشق ہے دستک نہ دیجیے اس پر
اگر تلاشِ زیاں ہے تو آئیے صاحب

بجھائیے درِ احساس کے چراغوں کو
یہ دل کا بوجھ بھی دل سے ہٹائیے صاحب

ہمیں بھی رازِ حقیقت سے آشنا کیجے
ورائے آئنہ کیا ہے دِکھائیے صاحب

یہ کار زارِ سخن ہے صلائے عام نہیں
اگر ہے زعم تو مصرعہ اٹھائیے صاحب

❖❖❖

◎

روایت کی حویلی کو گرانا پڑ گیا تھا
تعلّق اُس پری وش سے نبھانا پڑ گیا تھا

مَیں اپنی عمر سے پہلے جو بوڑھا ہو گیا ہوں
کسی کا بوجھ بھی مجھ کو اٹھانا پڑ گیا تھا

حدِ امکان سے آگے ہیولے رینگتے تھے
مجھے امکان کے اُس پار جانا پڑ گیا تھا

جو مَیں نے اپنا رخ بدلا زمانے کی طرف سے
مرے پاؤں میں آ کر پھر زمانہ پڑ گیا تھا

تعلّق کو نبھانا تو روایت ہے جہاں کی
مجھے ترکِ تعلّق بھی نبھانا پڑ گیا تھا

تمہارا نام بس اک بار آیا تھا لبوں پر
تو پھر کیا تھا، مرے پیچھے زمانہ پڑ گیا تھا

نئی تعمیر کی خواہش نے ایسے روند ڈالا
مجھے آبائی گھر کو بھی گرانا پڑ گیا تھا

❖❖❖

◎

دل کے احکامات کی تعمیل ہونے لگ گئی
میرے تشنہ خواب کی تکمیل ہونے لگ گئی

مَیں نے جیسے ہی جلایا اپنے حصّے کا چراغ
لمحہ بھر میں تیرگی تحلیل ہونے لگ گئی

برف سے بھالو بنائے جا رہے ہیں دھوپ میں
نوعِ انساں کی نئی تشکیل ہونے لگ گئی

کوئی لمحہ پہلے لمحے کا نہیں ہے ترجماں
ہر قدم پر زندگی تبدیل ہونے لگ گئی

ہم سمجھتے تھے وہ جس کو ننگِ تہذیبِ جہاں
اب وہ تبدیلی ہی سنگِ میل ہونے لگ گئی

ہاتھ جب قانون کا پہنچا تری دستار تک
دفعتاً آئین میں تاویل ہونے لگ گئی

❖❖❖

◎

تم کہاں ڈھونڈ رہے ہو مجھے، باہر نہیں مَیں
کوئی آوارہ بھٹکتا ہوا منظر نہیں مَیں

مَیں فقط تیری عقیدت کا طلبگار نہیں
آستانے پہ سجایا ہوا پتھر نہیں مَیں

ایک مدّت سے پڑے ہیں مرے در پر تالے
اک صدا گونجتی رہتی ہے کہ گھر پر نہیں مَیں

مجھ پہ چڑھ کر تُو ستاروں کو نہیں چھو سکتا
گو قد آور ہوں مگر اتنا قد آور نہیں مَیں

مجھ کو خمدار سی راہوں میں تلاشا نہ کرو
کسی پاؤں کی لگائی ہوئی ٹھوکر نہیں مَیں

اس کی آنکھوں میں اترنا تو مرے بس میں نہیں
اے مرے عشق سمندر کا شناور نہیں مَیں

مَیں اسے چاہتا تھا، مجھ پہ یقیں کر احمدؔ
یہ بھی مَیں جانتا تھا اس کا مقدّر نہیں مَیں

❖❖❖

◎

تیرِ نظر جو چشمِ کماں سے نکل گیا
جس دل کو جا لگا وہ جہاں سے نکل گیا

جو بھی جنابِ عشق کی بیعت میں آ گیا
سمجھو وہ شخص وہم و گماں سے نکل گیا

اُس کا عجیب رنگ تھا گدلا گیا تھا مَیں
اچھا ہوا کہ وہ مری جاں سے نکل گیا

صف باندھ کر کھڑے تھے سبھی دشمنانِ عشق
پھر بھی وہ تیز گام میاں سے نکل گیا

وہ ایک لفظ جس کی اماں میں تھی میری ذات
وہ لفظ دفعتاً ہی زباں سے نکل گیا

جب سے تکلّفات کے آسیب آ بسے
اک گھر مکین تھا جو، مکاں سے نکل گیا

❖❖❖

◎

بدل کے بھیس نیا روپ دھارنا ہے مجھے
پھر اس کے بعد کسی کو پکارنا ہے مجھے

دیارِ دل میں چراغاں بھی مجھ کو کرنا ہے
تجھے بھی شیشۂ دل میں اتارنا ہے مجھے

ابھی تو نسبتیں تجھ سے ادھوری لگتی ہیں
ابھی تو ہجر کا موسم گزارنا ہے مجھے

مجھے یہ ڈر ہے بدن نیلگوں نہ ہو جائے
رگوں میں پھیلا ہوا زہر مارنا ہے مجھے

جہاں پہ آخری مجھ کو قیام کرنا ہے
وہ گھر بھی حسنِ عمل سے سنوارنا ہے مجھے

مَیں گرد گرد ہوا ہوں غبارِ عصیاں سے
فقط وہ تُو ہے کہ جس نے نکھارنا ہے مجھے

❖❖❖

◎

وہ جن کے غم میں کٹی یا وہ جن کے ڈر میں رہے
ہمارے ساتھ سدا زیست کے سفر میں رہے

یہ اختیار بھی ہم نے اسی کو سونپ دیا
ہمارے دل میں رہے یا کہ چشمِ تر میں رہے

اسی کی نوک پلک کو سنوارا جاتا ہے
جو ظرفِ خاک کسی چشمِ کوزہ گر میں رہے

زمانہ بیت گیا راستہ نہیں بدلا
تمہارے نقشِ قدم ہی مری نظر میں رہے

وہ جس کے زہر نے سب ذائقے بدل ڈالے
تمام عمر اسی جستجوئے زر میں رہے

رہے تو ہم بھی جہاں میں پر اس طرح احمدؔ
کہ جیسے اجنبی کوئی کسی کے گھر میں رہے

❖❖❖

◎

مجھ کو ٹھوکر نہ لگا، ورنہ چٹک جاؤں گا
تیرے پہلو سے کسی روز سرک جاؤں گا

تیری دنیا کو بدلنا تو مرے بس میں نہیں
اپنے احساس کی سولی پہ لٹک جاؤں گا

مَیں وہ عاشق ہوں جسے ہار گوارا ہی نہیں
تجھ کو پانے کے لیے تا بہ فلک جاؤں گا

دستِ گل پاش نے مجھ کو جو بلایا کسی دن
مَیں گلستان کی مانند مہک جاؤں گا

یہ جہاں دعوتِ نظّارۂ زیبائش ہے
تُو نے مجھ کو نہ سنبھالا تو بھٹک جاؤں گا

مَیں پسِ آئنۂ چشم پڑا ہوں احمدؔ
اشکِ حسرت ہوں کسی روز چھلک جاؤں گا

❖❖❖

◎

عجیب طرزِ تغافل سے آرزو کرنا
کسی کو کھوجنا اور تیری جستجو کرنا

ہمارا حال تو کٹھ پتلیوں کے جیسا ہے
جو لوحِ حق میں لکھا ہے وہ ہوبہو کرنا

ڈبو دیا ہے اسی خصلتِ حمیدہ نے
اٹھا کے آئنہ ہر اک کے روبرو کرنا

ہمارے روز و شب اس کام میں گزرتے ہیں
لگا کے زخم مسلسل انہیں رفو کرنا

تمہاری یاد کی مے نوش کر کے مستی میں
تمام رات مداوائے ہاؤ ہُو کرنا

نماز کیسے پڑھو گے کبھی یہ سوچا ہے
تمہیں تو خیر سے آتا نہیں وضو کرنا

❖❖❖

◎

ہزاروں سال پرانی مری کہانی ہے
یہ ٹیکسلا یہ ہڑپہ مری جوانی ہے

جہانِ ہست میں دو چار ہی بچے ہوں گے
کہ جن کے ساتھ مری دوستی پرانی ہے

کہو تو آس کی قندیل بھی بجھا دیں ہم
ہمارے پاس تمہاری یہی نشانی ہے

اٹھو! یہاں سے کوئی اور کاروبار کریں
ابھی تو عشق کے بازار میں گرانی ہے

اسی لیے تو کڑی دھوپ میں سکوں سے ہوں
تمہاری یاد کی چادر جو سر پہ تانی ہے

رگوں میں اس لیے بھی ارتعاش ہے احمدؔ
لہو کے ساتھ ترے عشق کی روانی ہے

❖❖❖

◎

کبھی بگڑتا کبھی استوار ہوتا ہے
مزاجِ یار کہاں ساز گار ہوتا ہے

شجر یونہی تو نہیں مجھ سے گفتگو کرتے
مرا پرندوں کی صف میں شمار ہوتا ہے

سمجھ تو آتا نہیں یہ حیات کا قصّہ
مگر یہ کھیل یہاں بار بار ہوتا ہے

عبور کیسے کروں گا مَیں آگ کا دریا
یہ سوچ سوچ کے دل اشکبار ہوتا ہے

وہ میرے دستِ کہن کو رسائی کیسے دے
زمانہ جس کی ادا پر نثار ہوتا ہے

اسی لیے کوئی منظر کھلا نہیں احمدؔ
کبھی نظر کبھی دل میں غبار ہوتا ہے

❖❖❖

◎

حکم ہوا تھا ہجر کے لمحے صبر اور شکر سے کاٹیں
زیست کی دیواروں کو ہم سب دھیرے دھیرے چاٹیں

جام چھلکتے ہیں اور دامن گیلے ہو جاتے ہیں
اپنا اپنا ظرف ہے سب کو یکساں کیسے بانٹیں

پیچھے فرعونی لشکر ہے آگے سرکش دریا
موسیٰؑ ساتھ نہیں ہے اپنے دریا کیسے پاٹیں

پانی بھرنے کی خاطر ہی مل لیتے تھے ہم لوگ
کدھر گئے وہ کنویں پنگھٹ کہاں گئیں وہ گھاٹیں

اُس کی مرجھائی صورت کو دیکھا تو یہ جانا
وقت بجھا دیتا ہے دیکھو کیسی کیسی لاٹیں

❖❖❖

◎

سالہا سال سے تم مجھ سے خفا اتنی ہو
جرم اتنا تو نہیں تھا کہ سزا اتنی ہو

سانس آ جائے سہولت سے یہی کافی ہے
میرے اطراف کم و بیش ہَوا اتنی ہو

مجھ کو انعام کے کفران سے ڈر لگتا ہے
جس قدر میری ضرورت ہے غذا اتنی ہو

میں کسی اور کا محتاج نہ ہونے پاؤں
زیست بھی مجھ کو عطا میرے خدا اتنی ہو

یہ جہاں دیکھے مجھے رشک بھری آنکھوں سے
مجھ گنہگار پہ رحمت کی عطا اتنی ہو

مَیں نے جس شخص کی الفت میں جہاں چھوڑ دیا
کاش اس شخص میں بھی شرمِ وفا اتنی ہو

❖❖❖

◎

اس کی قید میں رہنا ہی آزادی ہے
ورنہ تو بربادی ہی بربادی ہے

خاموشی کو امن علامت مت سمجھو
داد رسی ہو تو ہر اک فریادی ہے

صاف دلی کے معنی تم بھی جانتے ہو
ملنا ہو تو شرط یہ سیدھی سادی ہے

اور کہیں پر اس کا لگنا نا ممکن
یہ دل تیری صحبت کا ہی عادی ہے

ساون جیسے بھیگے بھیگے موسم نے
دل کے جنگل میں اک آگ لگا دی ہے

بس میں کہاں ہے عشق محبت کارِ جنوں
فعل یہ سارا احمدؔ غیر ارادی ہے

❖❖❖

◎

ہم کو غم راس ہے احمدؔ نہ خوشی بھائے ہے
کوئی ''آہا'' ہے زباں پر نہ کوئی ''ہائے'' ہے

میرے انکار پہ وہ شخص تُلا بیٹھا ہے
جو مرے نام سے تسلیم کیا جائے ہے

اُس نے جاتے ہوئے کچھ بھی نہیں بولا مجھ سے
بس یہی دکھ مجھے دِیمک کی طرح کھائے ہے

ایک موہوم سی منزل کی طرف کھینچے ہے
دل نہ جانے مجھے کس سمت کو لے جائے ہے

کیا مجھے اُس سے محبت تو نہیں ہے احمدؔ
آپ فرماتے ہیں کیا آپ کی کیا رائے ہے

❖❖❖

◎

میں جس سے خوف زدہ تھا وہ آ لگی ہے مجھے
زمانے بھر کی ستمگر ہَوا لگی ہے مجھے

گھنیری چھاؤں مرے ساتھ ساتھ چلتی ہے
کسی پرانے شجر کی دُعا لگی ہے مجھے

نہ دن کو چین میسّر نہ رات کو آرام
یہ کوئی عشق نہیں ہے بلا لگی ہے مجھے

مَیں چلتے چلتے اچانک ٹھٹکنے لگتا ہوں
کہ جیسے کوئی کہیں سے صدا لگی ہے مجھے

مری زباں پہ تجھے کیوں یقیں نہیں آتا
ہزار بار تو مَیں نے کہا ، لگی ہے مجھے

❖❖❖

◎

جاری ہے کائنات میں امکان کا سفر
اس بات پر ہے منحصر انسان کا سفر

تنہا مسافرت کا تصوّر نہیں کوئی
باہم رہا ہے نفع و نقصان کا سفر

شعلوں پہ پاؤں دھر کے گزرتے ہیں عشق باز
مشکل بہت ہے دوستو! ایمان کا سفر

رشتے بنا رہا ہے مسلسل نئے نئے
رکتا نہیں کہیں تری مسکان کا سفر

فکرِ معاش ، حسنِ طلب ، سخت کوشیاں
کتنی حسیں مثال ہے دہقان کا سفر

❖❖❖

◎

وہ کسی اور کو کیوں آنکھ اٹھا کر دیکھے
اپنے خالق کو جو محبوب بنا کر دیکھے

اتنا آسان نہیں خالق و باری ہونا
بارِ ہستی کو کوئی سر پہ اٹھا کر دیکھے

لوٹ جائے گی ہوا خائب و خاسر ہو کر
عزم و ہمت سے کوئی دیپ جلا کر دیکھے

کیوں نشاں چھوڑ کے جاتے نہیں جانے والے
مَیں نے رستوں سے کئی سنگ اٹھا کر دیکھے

اس کی یادوں کی نمائش ہی لگی رہتی ہے
کاش اک بار مرے پاس وہ آ کر دیکھے

وہ جو سچا ہے تو کیوں رستہ بدل لیتا ہے
اتنی ہمت ہے تو پھر سامنے آ کر دیکھے

❖❖❖

''کھنکتی خاک''، مشاہیر کی نظر میں

محترم پروفیسر احمد ساقیؔ کا اولین شعری مجموعہ ''کھنکتی خاک'' کے نام سے **2014ء** کے اواخر میں منصۂ شہود پر آیا۔ جسکی پذیرائی کے سلسلے میں مختلف شہروں میں تقریبات منعقد ہوئیں۔ جن میں ملک کے ممتاز اربابِ نقد و نظر اور مؤقر شعرائے کرام نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے انکی شاعری کی مختلف جہتوں پر اظہارِ خیال فرمایا۔ میں نے سوچا، کیوں نہ انکی آراء کے مختلف حصوں کو قلمبند کر لیا جائے۔

ظفر اقبال

روزنامہ دنیا میں جناب ظفر اقبال نے ''کھنکتی خاک'' پر اپنے کالم ''دال دلیا'' میں بعنوان ''اے بسا آرزو کہ خاک شد'' ایک دلچسپ انشائیہ لکھا۔ جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

شاعر احمد ساقیؔ کے ساتھ ہمارا معاملہ اس خاتون کی طرح ہے جو لکھتی ہیں کہ بیس سال تک اپنی ساس سے میرے تعلقات خوشگوار رہے۔ کوئی پچیس تیس برس پہلے جب موصوف گورنمنٹ کالج پتوکی میں تعینات تھے ہم اوکاڑہ سے وہاں مشاعرہ پڑھنے جایا کرتے تھے۔ غائبانہ تعلق پھر بھی برقرار رہا۔ یہ کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے کی بات ہے کہ اوکاڑہ میں میرے ساتھ ایک شام تھی۔ جس کا نہ صرف احمد ساقی نے بائیکاٹ کیا بلکہ کچھ شعراء کو بھی اس میں شرکت سے روکے رکھا۔ تقریب تو خیر ہو گئی مگر ان کا رویہ بہت مایوس کن تھا۔ جب انکی کتاب ''کھنکتی خاک''، موصول ہوئی تو سوچا کہ اب سنہری موقع ہے، کیوں نہ موصوف کو بتایا جائے کہ ایک شریف آدمی کی تقریب کا بائیکاٹ کس طرح کیا جاتا ہے۔

طوعاً و کرہاً کتاب کا انتساب پسند کرنا پڑا۔ شروع شروع میں دو تین اشعار پر بھاری دل کے ساتھ پسندیدگی کا نشان یہ سوچ کر لگانا پڑا کہ کوئی بات نہیں، کتاب میں چند اشعار اچھے نکل ہی آتے ہیں۔ لیکن مایوسی تھی کہ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ کیونکہ خلافِ توقع بلکہ خلافِ خواہش اچھے اشعار نکلتے ہی چلے آ رہے تھے۔ پھر خیال گزرا کہ موصوف نے یہ کتاب کسی سے لکھوائی ہے کیونکہ اتنی اچھی شاعری کم از کم احمد ساقی تو نہیں کر سکتا۔ خیال تو تھا کہ اس کے بخیئے ادھیڑوں گا مگر۔۔۔ (کالم کے آخر میں پچیس پسندیدہ اشعار تحریر کیے۔)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

بعض لوگ دیر سے شعر کی طرف آتے ہیں اور دوسرے شعراء سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔انگلش میں انہیں لیٹ ڈویلپر (Late Developer) کہا جاتا ہے۔احمد ساقی بھی ان میں سے ایک ہیں۔ان کی شاعری اپنی انفرادیت کی وجہ سے نہ صرف اپنی طرف متوجہ کرتی ہے بلکہ چونکاتی ہے۔
کوئی شاعر اس وقت تک بڑا شاعر نہیں بن سکتا جب تک وہ دوسروں سے مختلف ہو کر نہ آئے۔جب تک شاعر میں چیزوں کو آڑھے ترچھے زاویوں سے دیکھنے کی صلاحیت نہ ہو، وہ منفرد شعر کبھی نہیں کہہ سکتا۔میری نظر میں احمد ساقی کا یہ مجموعہ اتنی طاقت رکھتا ہے کہ دیر تک یاد رہے اور ان شاءاللہ یاد رکھا جائے گا۔

نذیر قیصر

میری نظر میں اردو شاعری میں غالب ، اقبال اور راشد ایسے شاعر گزرے ہیں جنکی شاعری میں فکری حوالے سے انسان، کائنات اور خدا کے مابین مکالمہ ملتا ہے۔احمد ساقی کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے حیرت سے لبریز خوشی کا احساس ہوا کہ غالب، اقبال اور راشد کے بعد ایسا فکری مکالمہ احمد ساقی کی شاعری میں موجود ہے۔میں نے دو تین بار ”کھنکتی خاک“ کا مطالعہ کیا اور ہر بار ایک نیا در کھلا۔

غلام حسین ساجد

مجھے ”کھنکتی خاک“ کے شاعر احمد ساقی نے غیر مروجہ بحور (جنہیں اردو شاعری کے اعتبار سے کنواری قرار دینے میں بھی کوئی حرج نہیں) میں اشعار کہہ کر فنی جہت سے حیرانی میں مبتلا کر دیا۔ان کے اس تجاوز نے فکری تنوع کے ایسے ایسے در وا کیے ہیں جو اردو شاعری کی روایت میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔مضامین کے تنوع کے اعتبار سے ”کھنکتی خاک“ کو ایک معتبر حوالہ قرار دینا پڑتا ہے۔یہ کتاب صاحب ذوق قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ ہے جسکی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر ناہید شاہد (مرحوم)

”کھنکتی خاک“ کی شاعری کو پڑھتے ہوئے میں کئی قسم کی حیرتوں میں گم رہا ہوں۔یہ بالکل عام شاعری نہیں ہے۔ان کا محاورہ دیکھ لیجیے۔ان کی بحور دیکھ لیجیے۔اور پھر اس میں جو موضوعات بیان کیے گئے ہیں ان کو دیکھ لیجیے۔آپ کو خیال کی ایک نئی جہت اور انہیں پیش کرنے کا نیا سلیقہ نظر آئے گا۔

ڈاکٹر اختر شمار

شاعری کا شعور سے گہرا تعلق ہے۔اچھی اور بڑی شاعری تو قاری کے دل میں بھی ایک روشنی سی بھر دیتی ہے۔ایسی شاعری پڑھ کر روح سرشار ہو جاتی ہے۔انسان آگہی کی پگڈنڈی پر جا نکلتا ہے۔ احمد ساقی اسی قبیلے کے شاعر ہیں۔آپ ''تنگ بند'' شاعر نہیں۔نہ ہی دوسروں کے شجر خیال پر اپنی کونپل کی پیوندکاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ساقی تو دل کی دھڑکنوں کو سخن میں ڈھالنے پر قادر ہے۔

قائم نقوی

آج کے غزل گو شعراء جو غزل کو اپنا خون جگر دے رہے ہیں ان غزل گو شاعروں میں احمد ساقی کا نام واضح نظر آتا ہے۔احمد ساقی اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے ہم عصر شعراء سے مختلف نظر آتا ہے۔ احمد ساقی کے اولین شعری مجموعے ''کھنکتی خاک'' میں شامل غزلیں پڑھ کر اس بات کا احساس ہوا کہ اس کا شعری اسلوب دوسرے شعراء سے مختلف ہے۔اس کے ہاں تجس،بے ساختگی،کبھی نہ ختم ہونے والی حیرت ہے۔لوگ سوتے میں خواب دیکھتے ہیں وہ جاگتے میں خواب دیکھتا ہے۔

خورشید بیگ میلسوی

جناب خورشید بیگ میلسوی نے ادبی رسالے ''ماہِ نو'' کے اپریل **2015**ء کے شمارے میں ایک مضمون بعنوان احمد ساقی کا تازہ مجموعہ ''کھنکتی خاک، ایک صوتِ نادر'' لکھا جس کی چند سطریں درج ذیل ہیں۔

اردو ادب کے جمالِ غزل کی ہر پرت اور ہر صوت نادر ہے اور اس صدی میں یہ ندرت احمد ساقی کے مجموعہ کلام ''کھنکتی خاک'' میں صاف نظر آ رہی ہے۔غالب نے مضامین نو کے انبار لگانے کا جو سلسلہ شروع کیا وہ اپنی مکمل جلوہ سامانی کے ساتھ احمد ساقی کے ہاں ظہور پذیر ہوا ہے۔غزل اسی کی احسان مند ہوتی ہے جو اس کے دامن کو اپنے تخلیقی وجدان کے پھولوں سے بھر دے۔اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔آمین

نوٹ: محترم ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر خواجہ زکریا، عباس تابش، قمر رضا شہزاد کی آراء ''کھنکتی خاک'' کی زینت ہیں۔

مرتب : محمد نعمان حمید (اوکاڑا)